بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔حج

جب سے انسان نے آنکھ کھولی ہے وہ اسی تگ وتاز میں غلطاں و پیچاں رہا کہ وہ کون سی صورت پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن وسلامتی سے رہ سکیں۔اسے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان گنت تجارب کی بھٹیوں اور سنگلاخ وادیوں سے گزرنا پڑا۔لیکن وہ مقصود حاصل نہ کر سکا۔ زمان و مکاں ہر آن بدلتے رہے۔نظریات حیات میدان تصادم میں برسر پیکار رہے۔ Antithesis, Thesis اور Synthesis کا عمل عقل محض کی ابلہ فریبیوں میں عافیت کوش رہا۔اس طرح انسان اپنے ہی ہاتھوں سراب کا شکار ہوتا رہا۔ مدت کے بعد پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر اقوام مغرب نے جمیعتہ الاقوام (League of Nations) کی طرح ڈالی جو کردار اور عمل کے فقدان کی وجہ سے بری طرح ناکام ہوئی۔علامہ اقبالؒ نے تو اسے کفن چوروں کی جماعت کہا تھا۔اس کی ناکامی کی وجہ (Mr. Reeves) اپنی کتاب (Anatomy of Peace) میں لکھتا ہے کہ ''لیگ آف نیشنز'' کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم ہوئی تھی۔اس کا خیال تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے نمائندوں کو یک جا کر کے باہمی بحث وتمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔اس ناکام تجربے کے بعد ''لیگ آف نیشنز'' کی جگہ یعنی اس کا نام بدل کر (United Nations Organisation) اقوام متحدہ کی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔جس طرح سے یہ ناکام ہوئی ہے۔اس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔وہ اس طرح کہ اس کی ایک سیکیورٹی کونسل ہے جس کے پندرہ مستقل رکن ہیں۔ان میں سے پانچ یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین کو حق استرداد (Veto) کا اختیار دیا ہوا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی معاملہ سیکیورٹی کونسل منظور کر دے تو ان میں سے کوئی رکن بھی اسے رد (Veto) کر سکتا ہے جس سے تمام کارروائی منسوخ ہو جاتی ہے۔گویا ان کا یہ عمل ان کے اپنے وجود کی نفی ہے۔ظاہر ہے جو جماعت اپنے وجود کی خود نفی کر دے منطقی طور پر (Virtually) اس تنظیم نے پورے کے پورے ادارے کو کالعدم کرنے کے خود اسباب پیدا کر رکھے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا کے مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔دوسری اقوام کو تو چھوڑیئے، مسلمانوں کا کوئی مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔کشمیر کا مسئلہ 1948ء سے اس کے ایجنڈا پر ہے اور ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔اسرائیل سے عرب علاقے خالی نہیں کرا سکی۔افغانستان اور عراق آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔اس کا کوئی فیصلہ نہیں کرا سکی۔یہ چند مسائل ہیں جن کا تعلق عالم اسلام سے ہے۔باقی علاقوں کے مسائل کا بھی

کوئی خاطر خواہ حل نہیں ہوسکا۔ کافی عرصہ ہوا لندن کے اخبار ''ڈیلی میل'' نے لکھا تھا کہ جمعیت اقوام اپنی موجودہ ہیئت میں امن عالم کے لئے سخت خطرہ کا موجب ہے اس لئے اسے فوراً ختم کر دینا چاہئے'' اور اس کی وجہ (Mr. Reeves) کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے۔ وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعے دور نہیں ہوسکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوع انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت۔ یعنی یہ وہی چیز ہے جسے علامہ اقبال نے کہیں پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

یہ حشر ہوا اس نظریہ حیات کا جو وحی کی راہنمائی سے محروم تھا اور صرف عقل کے گھوڑے پر سوار تھا۔

لیکن صدیوں پہلے وحدت آدم کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے مرکز انسانیت یعنی خانہ کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کیا کیونکہ مرکز کے بغیر انسانوں کا ایک برادری بننا اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ جب تعمیر کعبہ مکمل ہوچکی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا واذن فی الناس بالحج (22/27) ''تمام نوع انسانی کو یہاں جمع ہونے (حج) کا اعلان کر دے'' اور اس کی غایت یہ بیان فرمائی کہ لیشھدوا منافع لھم (22/28) ''تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں کہ نظام خداوندی کس طرح عالمگیر انسانیت کی منفعت بخشیوں کا ضامن ہے۔''

نصوص قرآنی سے حج کی جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں وہ اس طرح ہیں کہ تمام دنیا کے انسان بلاتفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز وطن و زبان، جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں، محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے، جو انسانی تقاضوں کا ترجمان ہے، اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت، مرکز وحدت انسانیت، یعنی بیت اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا

باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرا اپنے میں سے ایک امیر الامرا کا انتخاب کرلیں اور مختلف ممالک کے احوال وظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایسا پروگرام مرتب کرلیں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے۔ اس کو آج کل کی اصطلاح میں ''سالانہ ترقیاتی پروگرام'' (Annual Development Programme) کہا جاتا ہے۔ پھر ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اسی پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان' مقام منیٰ میں جمع ہوکر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات وجزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر ان کے (Pros and Cons) کا عملی اثر اور ردعمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں گے' اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی ہوں گی جس کے لئے بھیمۃ الانعام (5/11) کا ذبیحہ تجویز کیا گیا ہے جسے عرف عام میں قربانی کہتے ہیں۔ آخر میں یہ نمائندگان طواف کعبہ کے بعد اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں گے اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں اور نظم ونسق کو چلائیں گے۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن حکیم نے تمام نوع انسانی کو ایک امت واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے۔

قرآن حکیم کی رو سے اس اجتماع کی مکمل کارروائی کے لئے کم ازکم تین مہینے بتائے ہیں۔ الحج اشھر معلومٰت (2/197) اس سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔

یہیں سے اقوام متحدہ نے بھی اپنے سالانہ اجلاس کے لئے کم ازکم تین مہینے مقرر کر رکھے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

فریضۂ حج کا تقاضا ہے کہ اپنے اپنے ممالک کو لوٹ کر سب کچھ بھولنا نہیں بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو دنیا کے کسی گوشہ میں بھی ہو' زندگی کے کسی شعبہ میں مصروف تگ وتاز ہو اپنی توجہات کا رخ اسی مرکز کی طرف رکھو اور جو پروگرام وہاں سے مرتب کرکے لائے تھے۔ اس کا احترام کرنا ہوگا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ہوگا' کیونکہ آئندہ سال اپنی Progress Report وہیں جاکر پیش کرنا ہوں گی۔ اسی لئے خانہ کعبہ کو قبلہ کہا گیا ہے جس کو ہر وقت اپنے سامنے رکھا جائے۔ اگر کسی وجہ سے تکمیل پروگرام (A-D-P) میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس کے (Bottle Necks) حج کے دوران بیان کرنا ہوں گے تاکہ ان کا تدارک کیا جاسکے۔ اسی لئے حج کا مقصود قرآن حکیم میں خاص طور پر دو مقامات پر مختصراً بیان کردیا گیا ہے۔ ایک لیشھدوا منافع لھم 22/28 تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں اور اس کی غائت قیاماً للناس 5/97 یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ حج سے مقصود جمعیت آدم'' کی تشکیل تھا۔ لیکن آج حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کی لامرکزیت کی وجہ سے عالم اسلام چاروں طرف سے مصائب سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں

ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشہ پر کہیں انکا نشان رہنے نہ پائے۔لیکن ملت اسلامیہ تختۂ غفلت پر سوئی ہوئی خراٹے لے رہی ہے۔مسلمان ملکوں پر جو گزر رہی ہے آسمان کی آنکھ بھی اس پر پرنم ہے۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم وتشدد سے عاجز آ کر) فریاد کر رہے ہیں۔خدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم وتشدد پر کمر باندھ لی ہے نجات دلا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کر دے''۔القرآن 4/75۔

پاکستان تو کجا دنیا کا کوئی ملک ایسا ہے جو خدا کے متذکرہ حکم کے تحت مسلمانوں کی مدد کو پہنچ سکے؟ یہ وہی معاشرہ یعنی مرکز ملت (Central Authority) ہوسکتا تھا جس کی خصوصیت اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہوتی کہ ؎

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اسلامی معاشرہ یعنی مرکز ملت کی حیثیت آنکھ جیسی ہوتی ہے۔اگر انسانی جسم کے کسی حصہ میں تکلیف ہو تو آنکھ کو چین نہیں۔اسی طرح اگر دنیا کے کسی حصہ میں کسی ایک مسلمان پر بھی ظلم ہو رہا ہو تو مرکز ملت حرکت میں آجاتا ہے اور ظلم کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔لیکن افسوس!اس وقت وہ مرکز ملت کہاں جو قرآن کے قانون اور حکم کی قوت نافذہ بنتا!

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

ہماری لامرکزیت ہمارے زوال اور انحطاط کا سبب ہے۔اس لئے حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنس منعقد کرنے پر ہی اکتفاء کئے ہوئے ہیں۔عملی طور پر کچھ نہیں ہوسکا۔لیکن ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

یہ نمی تمسک بالقرآن سے پیدا ہوگی اور پھر جب ہم نے اپنے اللہ سے' بھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا' جس کی زندگی سے تمام نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے' اقوام عالم کی امامت ہمارے حصے میں آجائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشت حیات سرسبز وشاداب ہوگی۔آج مسلمانوں کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com

شرکِ خفی کا نادانستہ ارتکاب

قرآن کریم کے نزدیک شرک بدترین گناہ اور قبیح ترین جرم ہے۔ شرک جلی بہت واضح ہوتا ہے۔ بتوں کو پوجنا شرک جلی ہے اور ہر شخص کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ بت پرستی شرک ہے لیکن شرک خفی کی نوعیت ہی مختلف ہوتی ہے۔ یہ بھیس بدل بدل کر سامنے آتا ہے اور اس کے مرتکب کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ شرک کا ارتکاب کر رہا ہے خصوصاً زوال پذیر اقوام اس میں زیادہ مبتلا ہوتی ہیں۔ جب کسی قوم کو زوال آتا ہے تو وہ اپنے بزرگوں، انبیاء و اولیاء کو اللہ تعالیٰ کی خصوصیات میں شریک کر لیتی ہے اور یہی شرک ہوتا ہے۔ کسی شخص کو صفات خداوندی سے متصف کرنا شرک ہے۔

جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو وہ ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ بیمار خواہ غریب ہو اور خواہ امیر ہو وہ ڈاکٹر سے ہی رجوع کرے گا۔ ڈاکٹر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر، اس مریض کا علاج کرے گا، لیکن ضروری نہیں کہ وہ مریض صحت مند ہو جائے۔ ممکن ہے کہ وہ شفایاب نہ ہو سکے۔ اس ساری حالت میں بیمار ڈاکٹر کے علاج کی طرف ہی توجہ کرتا رہے گا لیکن شفاء کے لئے دعا صرف اللہ تعالیٰ سے کرے گا کوئی مریض ڈاکٹر سے شفاء حاصل کرنے کے لئے دعا نہیں کرے گا اگر کوئی شخص، اللہ کو چھوڑ کر، ڈاکٹر سے شفا حاصل کرنے کی دعا کرے گا تو وہ شرک کا مرتکب ہوگا۔

اسی مثال کے مطابق دیگر تمام معاملات مثلاً تجارت، سفر، مقدمات ان تمام چیزوں میں ہم دوسروں سے مدد حاصل کرتے ہیں لیکن دعا صرف اللہ تعالیٰ سے ہی کرتے ہیں۔ انسانوں کا آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا تو نہایت ضروری چیز ہے لیکن وہ مدد جو صرف تصرف الٰہی سے حاصل ہوتی ہے، اس کو کسی اور سے چاہنا، خدا کی خدائی میں دوسروں کو شریک کرنا ہے۔

وحی اور عقل میں بھی یہی فرق ہے۔ آپ اپنی مدد کے لئے کسی حکیم، دانا، دانشمند سے مشورہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کسی سے یہ درخواست نہیں کر سکتے کہ وہ وحی الٰہی حاصل کر کے، آپ کے کسی مسئلہ کا حل وحی کی روشنی میں پیش

کرے۔ اسی طرح کسی شخص کا اختیاری اقوال کو وحی قرار دینا' اس کو دوسرا خدا تسلیم کرنا ہے' وحی الٰہی خاص خدائی اختیار وتصرف میں ہوتی ہے۔ وہ کسی بشر کے اختیار کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ کسی بشر کے عقلی واختیاری افعال واقوال کو وحی کا درجہ دینا' اس کو خدا بنا دینا ہے اور یہ شرک خفی کے مرادف ہے۔ ہمارے علمائے کرام حضورﷺ کے ذاتی' اختیاری اقوال کو وحی خفی قرار دیتے ہیں تو وہ اسی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس بات کی وضاحت کہ انبیاء کرامؑ کے اقوال و افعال ذاتی' بشری ہوتے ہیں اور ان سے غلطی ولغزش کا امکان بھی ہوتا ہے' سابقہ مضامین میں کئی مرتبہ کر دی گئی ہے' اسی بارے میں قرآن کریم نے حضرت داؤد و حضرت سلیمانؑ کا واقعہ بھی اپنی دفتین میں محفوظ فرما دیا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انبیاء کرام کے اقوال بشری و ذاتی ہوتے تھے اور وہ اپنے فیصلوں میں غلطی بھی کر سکتے تھے۔ حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہم السلام دونوں رسول اور نبی تھے۔ دونوں نے ایک ہی مقدمہ کا فیصلہ مختلف دیا جس سے ازخود واضح ہو جاتا ہے کہ ایک نبی کا فیصلہ درست تھا اور دوسرے کا غلط تھا۔ آپ اس واقعہ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وداؤد وسلیمٰن اذ یحکمٰن فی الحرث از نفشت فیه غنمم القوم و کنا لحکمهم شهدین ففهمنا ها سلیمان وکلا اتینا حکما و علما (۲۱/۷۹)۔

اور داؤد وسلیمان جبکہ وہ دونوں فیصلہ کر رہے تھے کھیت کے بارے میں جب لوگوں کی بھیڑیں اس پر رات کو چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھنے والے تھے۔ تو ہم نے اسے سلیمان کو سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا۔

اس مقدمے کی تفسیر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے تحریر فرمائی ہے کہ:

''حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا کہ ایک شخص کے کھیت میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں آ گھسیں۔ کھیتی کا نقصان ہوا۔ حضرت داؤد نے یہ دیکھ کر کہ بکریوں کی قیمت اس مالیت کے برابر ہے جس کا کھیت والے نے نقصان اٹھایا تھا یہ فیصلہ کیا بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں۔ حضرت سلیمان نے فرمایا کہ میرے نزدیک کھیتی والا بکریاں اپنے پاس رکھے اور دودھ پیئے اور بکریوں والے کھیت کی آبپاشی اور تردد کریں جب

کھیتی جیسی تھی ویسی ہو جائے تو بکریاں لوٹا دیں اور کھیتی لے لیں اس میں دونوں کا نقصان نہ ہو گا۔ حضرت داؤد نے بھی یہ فیصلہ سن کر تحسین فرمائی اور اپنے اجتہاد سے رجوع کیا''۔ (صفحہ ۴۳۷)

تفسیر فصل الخطاب میں ہے کہ:

''جناب داؤد نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس زراعت کے عوض میں وہ بھیڑیں مالک کو دے دی جائیں مگر ان کے فرزند جناب سلیمان نے کہا کہ انصاف کی رو سے فیصلہ یہ ہونا چاہئے کہ بھیڑوں کے مالک زراعت کو دوبارہ درست کرنے کے ذمہ دار ہوں اور جب تک وہ زراعت اپنی اصلی حالت پر آئے اس زراعت کے مالک کو یہ حق ہو کہ وہ ان بھیڑوں کے دودھ وغیرہ سے فائدہ اٹھائے اور جب وہ زراعت اصلی حالت پر آ جائے تو وہ بھیڑوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دے۔ یہی فیصلہ تھا جسے خالقِ کریم نے صحیح قرار دیتے ہوئے اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔''

اس آیہ کریمہ کے ذیل میں مقدمہ کی جو تفاصیل بیان کی گئی ہیں وہ تمام تفاسیر میں تقریباً کچھ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک جیسی ہی ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ قرآن کریم نے ان تفاصیل میں سے کسی بات کا کوئی ذکر نہیں کیا' کیونکہ اس کا مقصد تو ایک اصول بیان کرنا تھا' اس کو مقدمہ کی تفاصیل سے کوئی غرض نہیں تھی۔

قرآن کریم سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی بکریوں کے ریوڑ نے کسی کھیت کو رات کے وقت چر لیا۔ وہ شکایت لے کر حضرت داؤد کے پاس آئے۔ حضرت داؤد نے اس کا فیصلہ فرما دیا۔ لیکن وہ فیصلہ کسی وجہ سے' یا تو انہیں غور کرنے کے لئے وقت کم ملا یا انہیں معاملہ کی پوری تفاصیل حاصل نہیں ہو سکیں۔ وہ معاملہ کی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکے اور فیصلہ غلط فرما دیا لیکن حضرت سلیمان نے اس کا فیصلہ صحیح فرما دیا۔ یہ سوال کہ پدر گرامی نے کیا فیصلہ کیا' اور فرزند نے کیا فیصلہ کیا خارج از بحث ہے اور مفسرین نے اس معاملہ کی جزئیات فراہم کرنے میں صرف وقت ضائع کیا ہے۔ اس مضمون میں صرف اس قدر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ دونوں حضرات نبی تھے اور دونوں کا فیصلہ ایک دوسرے کے خلاف تھا۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انبیاء کرام جو فیصلے مقدمات کے کرتے تھے وہ وحی پر نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ ان کے غور و فکر اور تدبر و تفحص کا نتیجہ ہوتے تھے۔ وحی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اور اسی وجہ سے ان میں صحت و سقم دونوں صورتوں کا امکان ہوتا تھا۔ انبیاء کرام کے ذاتی' بشری اقوال کو وحی کا درجہ دینے سے ان کو خدائی کا درجہ دینا ہوتا ہے۔ جو شرک خفی کے مرادف ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویزؒ

قوموں کے تمدن (کلچر) پر جنسیات کا اثر

SEX AND CULTURE

طلوع اسلام پر ایک یہ بھی اتہام اور الزام ہے کہ یہ اِباحیت پسندی کو فروغ دینے کا حامی ہے۔ ہمیشہ کی طرح پروپیگنڈہ کرنے والے اور پروپیگنڈہ قبول کرنے والے ''اندھے اور بہرے'' بن کر طلوع اسلام یا طلوع اسلام کے لٹریچر سے اس کی تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور اس پروپیگنڈہ کو آگے بڑھانے کے ''مقدس'' کام میں جُت جاتے ہیں۔ اُن کو کبھی کسی پیشوا نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کام اسلامی احکام کے منافی ہے۔ ذیل میں ہم جنسیات کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کر رہے ہیں جس سے ''تحفظِ حقوقِ نسواں بل'' کے مخالفین پر طلوع اسلام کا نقطۂ نظر معلوم ہوگا اور قارئین کے لئے بھی حقیقت تک رسائی حاصل ہوگی۔ **(ادارہ)**

جب زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی' حیوانی سطح سے انسانی پیکر پر پہنچی تو وہ حیوانی زندگی کے بعض خصائص ولزومات بھی اپنے ساتھ لائی۔ کھانا' پینا' سونا وغیرہ (جسم کا طبعی نظام) حیوان اور انسان میں مشترک ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ انسانی زندگی کی حیوانی سطح کے مظاہر ہیں۔ انہی میں افزائش نسل Procreation اور اس کے لئے جنسی جذبہ Sexual Instinct بھی شامل ہے۔

کھانے پینے کے معاملہ میں' حیوانات پر بعض پابندیاں فطرت کی طرف سے از خود عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً بکری گھاس کھاتی ہے گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے' گھاس نہیں کھاتا۔ بطخ کے بچے انڈوں سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کو پانی کی طرف گھیر کر بھی لے جائیں تو وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ حیوانات پر یہ پابندیاں از خود عائد ہوتی ہیں اور وہ انہیں توڑنے کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس' انسانی بچے کو دیکھئے۔ وہ سنکھیا کی ڈلی کو بھی اسی طرح بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح شاخ نبات (مصری کی ڈلی) کو۔ وہ کبھی دہکتے ہوئے کوئلے کو ہاتھ میں

پکڑ لیتا ہے اور کبھی پانی میں ڈبکیاں لگاتا دکھائی دیتا ہے اس پر فطرت کی طرف سے ازخود ایسی پابندیاں نہیں عائد ہوتیں جیسی حیوانات پر عائد ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ پابندیوں کے بغیر زندگی دوبھر ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناممکن بھی ہو جاتی ہے اس لئے انسان پر بھی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں یا تو معاشرے کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں اور یا مذہب کی طرف سے۔ (مذہب کے بجائے وحی کا لفظ زیادہ موزوں ہے اس لئے آئندہ صفحات میں اسے وحی ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ وحی سے مراد ہی ایسی پابندیاں جو انسانی معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ نہ ہوں بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوں)۔

معاشرتی پابندیاں :- معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں اور وحی کی رو سے متعین کردہ پابندیوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی پابندیاں بعض مصالح کی بناء پر بدلی بھی جا سکتی ہیں۔ لیکن وحی کی رو سے عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً معاشرہ کسی وقت فیصلہ کرتا ہے کہ لوگوں کو سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہئے۔ اس فیصلہ کی رو سے (Keep to the left) سڑک کا قانون قرار پا جاتا ہے لیکن اگر کسی وقت معاشرہ اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس قانون کو بدل کر ''دائیں طرف چلو'' کا قانون بھی نافذ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب وحی خداوندی نے کہا ہے کہ (مثلاً لحم خنزیر حرام ہے تو کوئی انسان اس قانون میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ وحی خداوندی کے ماننے والوں کو لحم خنزیر سے اسی طرح پرہیز کرنا ہوگا جس طرح بکری گوشت سے پرہیز کرتی ہے' اس فرق کے ساتھ کہ بکری ایسا اپنی مرضی سے نہیں کرتی۔ لیکن انسانوں کو ایسا اپنے اختیار وارادہ سے کرنا ہوگا۔

جنسی جذبہ پر پابندیاں :- کھانے پینے کے علاوہ جنسی جذبہ کی تسکین کے سلسلہ میں بھی حیوانات پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عائد ہوتا ہے۔ ایک بیل ہر روز گایوں کے گلے میں پھرتا رہتا ہے لیکن کبھی جنسی اختلاط نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ اسے گائے کی طرف سے استقرار حمل کا طبعی تقاضا اس کی دعوت نہ دے۔ لیکن انسان پر اس قسم کا کوئی کنٹرول نہیں عائد کیا گیا وہ جب جی چاہے اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کر سکتا ہے۔

حیوانات پر اس طبعی کنٹرول کے علاوہ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کسی قسم کا اخلاقی کنٹرول عائد نہیں کیا گیا (حیوانات کی صورت میں اخلاقیات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) لیکن انسان پر اس ضمن میں اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ پابندیاں معاشرہ کی طرف سے بھی عائد کی جاتی ہے اور وحی کی رو سے بھی۔ معاشرتی پابندیوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ یہ پابندیاں مختلف اقوام وممالک میں مختلف نوعیّتوں کی ہیں۔ نیز کسی ایک ہی قوم میں مختلف

زمانوں میں ان پابندیوں میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے (شادی کے بغیر) جنسی اختلاط کی صورت پیدا کر لیں تو معاشرے کی نگاہوں میں یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ یہ اسی صورت میں جرم قرار پائے گا جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ہو۔ ان پابندیوں میں ردوبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اس وقت تک وہاں یہ صورت ہے کہ اگر کسی غیر شادی شدہ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے اور بچے کا باپ اس لڑکی سے شادی نہ کرے تو وہ بچہ حرامی قرار پاتا اور سوسائٹی میں ذلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں وہاں ایک تحقیقاتی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ایسے تعلقات کو جائز سمجھا جائے۔ ان سے پیدا شدہ بچوں کو معاشرہ کا صحیح جزو قرار دیا جائے اور انہیں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھا جائے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس وقت ان فیصلوں پر تنقید و تبصرہ مقصود نہیں۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اگر معاشرہ چاہے تو اپنی عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی بھی کر سکتا ہے۔

وحی کی پابندیاں :- اس کے برعکس' اس باب میں وحی (یعنی قرآن کریم) نے بھی کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ ان پابندیوں کا ماحصل یہ ہے کہ معروف طریقہ پر شادی کے بغیر کسی لڑکے یا لڑکی (مرد یا عورت) کو جنسی اختلاط کی قطعاً اجازت نہیں اور شادی کے بعد' نہ بیوی کسی غیر مرد سے اختلاط پیدا کر سکتی ہے' نہ میاں کسی اور عورت سے۔ اس قسم کا اختلاط فرد کا نہیں بلکہ معاشرہ کا جرم ہے اور اس (جرم زنا) کی سزا معاشرہ کی طرف سے دی جاتی ہے اور ان پابندیوں میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔

مغرب کی جنسی بے باکیوں سے متاثر ہو کر ہمارے ہاں کے نوجوان طبقہ میں بھی یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق ایک طبعی تقاضے کی تسکین یا افزائش نسل کے لئے ایک حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے اور بس۔ اس معاملہ کو لڑکی اور لڑکے کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دینا چاہئے اور نکاح وغیرہ کی پابندی' محض قانونی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہونی چاہئے نہ کہ بالغ مرد اور عورت کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے۔ ان خیالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی (مغرب کی طرح) جنسی فوضویت (Sexual Anarchy) کی فضا عام ہوتی جا رہی ہے اور وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں (یعنی عفت و عصمت (Chastity)) کے مطالبہ کو غیر فطری جکڑ بندیاں قرار دیا جا رہا ہے۔

ان پابندیوں کی مصلحت :- سوال یہ ہے کہ کیا وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں محض معاشرہ میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے ہیں یا ان کا تعلق عالم انسانیت کے اجتماعی مصالح سے ہے۔ اگر ان کا مقصد محض معاشرتی نظم و ضبط ہے تو بے شک معاشرہ کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنے مصالح کے پیش نظر ان میں ردوبدل کر لے لیکن اگر ان کا تعلق

انسانیت کے کسی بنیادی مسئلہ سے ہے تو پھر کسی فرد یا افراد کے کسی گروپ کو اس کا حق نہیں دیا جا سکتا تا کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ان پابندیوں میں تبدیلی کر کے انسانیت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچائے۔ قرآن نے جب زنا کو معاشرہ کا جرم قرار دیا ہے تو اس سے مطلب یہی ہے کہ اس کے نزدیک جنسی تعلق محض ایک انفرادی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر اجتماعی انسانیت پر پڑتا ہے۔ دوسری طرف جب اس نے کہا کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ (۲۳/۱) هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۳/۵) تو اس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ عفت وعصمت کا' قوموں کی فلاح و بہبود سے گہرا تعلق ہے۔ جو قوم عصمت کی حفاظت نہیں کرتی وہ زندگی کے میدان میں فائز المرام(Prosperous) نہیں ہوسکتی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کی صداقت کی شہادت کیا ہے؟ جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے ان تمام دعاوی کو سچا مانتے ہیں۔ لیکن سوال ان لوگوں کا نہیں۔ سوال تو ان کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دعوے کو بطور ایمان(Faith) ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اس کے ثبوت میں علمی تائید اور شہادت چاہتے ہیں۔

قرآنی دعوے کی دلیل :- ان لوگوں (بالخصوص ہمارے نوجوان طبقہ) کا یہ مطالبہ ایسا نہیں جسے ہم لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیں اور انہیں ملحد و بے دین کہہ کر تیوریاں چڑھا لیں۔ قرآن اپنے ہر دعوے کی بنیاد علم و بصیرت پر رکھتا ہے اور اسے دلیل و برہان کی رو سے منواتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی قرآنی حقائق کھل کر سامنے آتے چلے جائیں گے سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ..... (۴۱/۵۳) ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تا آنکہ یہ چیز نکھر کر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جنسی تعلقات کے متعلق جس قدر تحقیقات ہمارے زمانے میں ہو چکی ہیں وہ قرآن کے دعوے کی کس حد تک تائید کرتی ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور وقت کا نازک ترین مسئلہ۔ اس لئے اس قابل کہ اس پر بڑی توجہ اور گہری فکر سے غور و خوض کیا جائے۔

غور و فکر :- جنسیات کے متعلق ہمارے ہاں کوئی تحقیق نہیں ہوئی اس لئے اس کے نتائج کو سامنے لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ایک جنسیات ہی پر کیا موقوف ہے۔ زندگی کے اور کون سے شعبے ہیں جن کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ریسرچ ہوئی ہو! حقیقت یہ ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہو چکا ہو اور تقلید کہن زندگی کی محمود روش قرار پا چکی ہو' ان میں فکری صلاحیتیں بہت کم باقی رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس مقصد کے لئے بھی مغرب کے محققین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔

علمائے مغرب کی تحقیقات :- یورپ میں (دیگر شعبوں کی طرح) جنسیات نے بھی ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے لئے وہاں تحقیقاتی ادارے قائم ہیں۔ علمائے عمرانیات Sociologists تہذیب کے مورخ، علمائے جنسیات اور ماہرین علم تجزیہ نفس Psycho-Analysts وغیرہم نے اس موضوع پر کافی چھان بین کی ہے اور جنسیات سے متعلق لٹریچر خاصی مقدار میں شائع ہو چکا ہے اور ہوتا چلا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کا بالعموم انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے قدیم باشندوں Primitive Tribes کے احوال وکوائف، بود و ماند، رسوم و معاشرت اور اجتماعی اعمال ومعتقدات کا مطالعہ کرتے اور اس طرح حاصل کردہ مسالہ (Data) سے نتائج مستنبط کرتے ہیں (۱)۔ اس مقصد کے لئے انہیں جن صبر آزما اور مشقت طلب مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں، قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گذار دی۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انہی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ وہی کچھ پہنا جو کچھ وہ پہنتے تھے۔ انہی کے ساتھ کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر، کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات انہی میں شادیاں بھی کیں اور اس طرح انہی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس طرح ان کے متعلق براہ راست معلومات بہم پہنچائیں۔ ان محققین نے دنیا کے قبائل کی معاشرت اور معتقدات کے مطالعہ کے بعد جن موضوعات کے متعلق اصول متعین کئے ہیں۔ ان میں جنسیات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرتب کردہ نتائج ہمیں اس حقیقت تک پہنچاتے ہیں کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا معاملہ محض شہوانی جذبہ کی تسکین تک محدود نہیں ہوتا۔ اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ کسی قوم کے تمدن (Culture) کا اس سوال سے گہرا تعلق ہے کہ اس قوم نے جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں اور اگر پابندیاں لگا رکھی تھیں تو وہ کس نوعیت کی تھیں۔

ڈاکٹر انون Dr.J.D.Unwin:- انہیں محققین میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر J.D.Unwin کا نام خاص شہرت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر انون نے دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے ۸۰ غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطہ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا ہے تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا ہے تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذب

اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائج تحقیقات کو اپنی گراں بہا کتاب (Sex and Culture) میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے:-

دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل۔ سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط کردہ نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

اصل کتاب سے بھی پہلے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:-

اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں۔(XIV)

اسی کلیہ کو اس نے اصل کتاب میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو۔ اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (ص ۳۴۰)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی تعلقات محض ایک حیوانی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دارومدار اسی جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ:-

اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (ص ۳۰۲)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:-

جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔ (ص ۳۳۰)

اس لئے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو۔ یعنی اسے دنیا میں عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آ جائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لئے دیکھنا چاہئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں جیسی وہ تبدیلیاں ہوں گی اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

جبری تجرد :- سب سے پہلے تجرد کی زندگی

(Celibacy) کو لیجئے جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلک خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ :

> جبری تجرد (Compulsory Celibacy) کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ (ص۸۴)

جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقائد یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ وہ تجرد کی زندگی وجہ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (Nuns) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلک خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی شرف انسانیت کی زندگی ہے تو دوسری طرف آج کل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عائد کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال یکسر غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں۔ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے (دیباچہ ص xii)

☆☆☆☆☆☆

تین گروہ :- اس تمہید کے بعد آگے چلئے۔ ڈاکٹر انون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ سب سے نچلے درجے کا نام (Zoistic) رکھتا ہے اور اسے اوپر (Manistic) کا درجہ ہے اور سب سے اوپر (Deistic) کا درجہ۔ اس کے بعد وہ ۸۰ قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جس گروہ نے کنوار پن (Pre-Nuptiali) کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کے پست ترین سطح پر تھے۔

۲۔ جن قبائل میں زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے۔

۳۔ تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و پاکارت (Chastity) کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ (ص۳۲۵-۳۰۰)

اس کے بعد ڈاکٹر انون، شادی کے بعد کے جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر پھر زور دیتا ہے کہ :

> شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں

کر سکتے جب تک شادی سے پہلے زندگی میں عفت وعصمت پر زور نہ دیا جائے۔(ص۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔یعنی

۱۔ عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی میں ایک عورت کا خاوند رہے ان کے رشتہ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے اس کا نام' اس کے نزدیک مطلق وحدت زوج (Absolute Monogamy) ہے۔

۲۔ رشتہ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہوسکتا ہو اسے وہ ترمیم شدہ وحدت زوج (Modified Monogamy) کی اصطلاح سے تعبیر کرسکتا ہے۔

۳۔ عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے اس کا نام اس کے نزدیک مطلق تعداد ازواج (Absolute Polygamy) ہے۔اور

۴۔ اگر مرد' دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کرے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔اسے وہ ترمیم تعداد ازواج (Modified Polygamy) کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ:

آج تک کوئی قوم شق نمبر ا کے ''مطلق وحدت زوج'' کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی۔(ص۳۴۴)

اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردعمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر ''کامل آزادی'' کا مطالبہ کر دیتی ہے اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت (Sexual Anarchy) جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔(ص۳۴۵)

بہترین تمدن کی حامل قوم :- اس کے بعد ڈاکٹر انون نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام وقبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے۔ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی اور شادی کے بعد شق نمبر۲ کی ترمیم شدہ وحدت زوج کی پابند تھی۔یعنی جن کا عام اصول یہ تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔

رشتہ نکاح محکم و استوار ہو لیکن ناقابل تنسیخ نہ ہو بلکہ بعض حالات کے ماتحت منقطع ہوسکتا ہو یہ بعینہ وہ شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عائد کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون نے مختلف ماہرین علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں وہ کہتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کی حد بندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ (Tension) پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز (Compression) پیدا ہو جاتا ہے۔ (ص ۳۱۳)

یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں کظامت (Cublimation) کہا جاتا ہے چنانچہ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ

> نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود و پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوت فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبہ خویش کی صلاحیت بھی۔ (ص ۳۱۷)

فرائڈ کی تحقیق :- بہتر ہو کہ اس موقعہ پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آجائیں۔ وہ لکھتا ہے کہ :

> ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے قدیم جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ہے اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے (جب ان کی بے باکانہ تسکین ہی مقصد زندگی نہ بن جائے تو) یہ اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں (جسے Sublimation کہتے ہیں) اور اس طرح افراد کی فالتو توانائی، جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ فرائڈ کی تحقیق کے مطابق اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تہذیب و تمدن کے قصر حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ہیں (۲)۔

قرآنی کظامت :- فرائڈ نے اس طریق عمل کا نام Sublimation رکھا ہے۔ یہ علم تجزیہ نفس (Psycho-Analysis) کی ایک اہم اصطلاح ہے اور دور حاضر کی ایک گراں قدر نفسیاتی تحقیق لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ انسانی ذہن نے جہاں اسے بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے، قرآن نے چھٹی صدی عیسوی

میں (جسے عام طور پر ازمنہ مظلمہ (Dark-Ages) کہا جاتا ہے) کس طرح اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سورہ آل عمران میں مومنین کی ایک صفت الکاظمین الغیظ بتائی گئی ہے۔اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے لانا ضروری ہے۔عرب ایک گرم اور خشک ملک ہے جہاں پانی کی اکثر قلت رہتی ہے وہ کرتے یہ تھے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کنویں کھودتے۔ ان میں کسی میں کم پانی نکلتا کسی میں زیادہ۔ پھر وہ ان کنوؤں کو آبدوز نالیوں (Subterranean Channels) کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیتے۔ اس طرح جس کنویں میں پانی زیادہ ہوتا۔اس کا فالتو پانی دوسرے کنویں کی طرف منتقل ہو جاتا اور یوں تمام کنوؤں میں پانی کی تقسیم یکساں ہو جاتی۔اس طریق عمل کو ان کے ہاں کظامت کہا جاتا تھا۔لہٰذا کاظمین الغیظ کے معنی ہوئے وہ لوگ جو اپنی اس حرارت اور توانائی کو جو غصے کی شکل میں باہر نکلنا چاہتی ہے۔کسی دوسری طرف منتقل کر کے اس سے تعمیری نتائج کا کام لیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عصر حاضر کے ماہرین تجزیہ نفس نے (Sublimation) سے تعبیر کیا ہے۔

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر انون نے بتایا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوت فکر وعمل اور محاسبہ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔اس کے برعکس جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں۔ان میں فکر وعمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے-نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی۔(ص ۳۹۸)

اضمحلال :- قرآن کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ولا یزنون وہ زنا کی قریب تک نہیں جاتے۔اس لئے کہ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا (۲۵/۶۸) جو قوم ایسا کرتی ہے اسے **اثم** سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔عربی زبان میں **اثمتہ** اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چل سکے۔اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔آپ غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔جس تک دور حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔یعنی یہ کہ جنسی جذبات کو آزاد نہ چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔اس میں وہ معاشرتی توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انون نے یہ بھی کہا ہے کہ

مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائی پیدا کر سکتی ہے جب عورتیں باعصمت ہوں اور ان کی عصمت' شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ رہے۔ (ص ۳۲۳)

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے قرآن مردوں اور عورتوں دونوں کی عصمت پر یکساں زور دیتا ہے وہ حٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ (وہ مرد جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوں) کے ساتھ وَالْحٰفِظٰتِ (۳۳/۳۵) بھی کہتا ہے۔ یعنی وہ عورتیں جو اپنے دامن عفت کو قطعاً داغدار نہ ہونے دیں اور جرم زنا کی سزا بھی مرد وعورت دونوں کے لئے یکساں تجویز کرتا ہے (۲/۲۴)۔

قرآنی حد بندی :- قرآن کی رو سے جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی صورت جائز ہے۔ یعنی نکاح۔ لہٰذا قبل از نکاح جنسی اختلاط اور نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے یا مرد کا کسی دوسری عورت سے جنسی اختلاط (خواہ وہ تراضی مابین ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے۔ نکاح کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ ''ہنگامی جنسی اختلاط کی رضامندی'' نہیں ہوتی بلکہ معاہدہ ہوتا ہے اس امر کا کہ ہم (میاں بیوی) ان تمام قیود وحدود اور حقوق وفرائض کے مطابق جو ہم پر قرآن نے عائد کی ہیں مستقل رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر انون نے اپنے ہاں زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا (اسے اس لفظ کے استعمال کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں کر رہا بلکہ جنسی مسئلہ کے متعلق علمی اور نظری تحقیق کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کا انداز سائنٹیفک ہونا چاہئے تھا (اس نے اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع (Sexual Opportunities) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہوں گے وہ قوم تمدنی سطح میں بہت پست ہوگی اور جس میں یہ مواقع کم از کم حد تک رکھے جائیں گے وہ تمدنی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن نے صرف زنا ہی کو حرام قرار نہیں دی بلکہ جنسی اختلاط کے مواقع کو کم سے کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں قبل از نکاح' جنسی اختلاط کے مواقع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ زنا ہے۔ نکاح کا معاہدہ اس کے نزدیک عمر بھر کی رفاقت (Life-long Companionship) کا معاہدہ ہے۔ لہٰذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو پھر اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (پختہ عہد) کہا ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں کہا ہے کہ جب جی چاہا کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اسے مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔

وحدت ازدواج :- علاوہ بریں اس نے وحدت زوج

(Monogamy) کو بطور اساسی اصول مقرر کیا ہی اور تعداد ازواج کو محض ایک ہنگامی تمدنی مشکل کے حل کے لئے بطور عارضی علاج جائز قرار دیا ہے (اس کی بھی محض اجازت ہے، حکم نہیں) آپ دیکھیں گے کہ شادی کی یہ (قریب قریب) وہی شکل ہے جسے انون نے مطلق وحدت زوج (Absolute Monogamy) کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ میں نے ''قریب قریب'' اس لئے کہا ہے کہ ڈاکٹر انون کے نزدیک ''مطلق وحدت زوج'' میں شادی صرف اسی صورت میں منقطع ہوسکتی ہے جب عورت جنسی (اخلاقی) جرم کی مرتکب ہو جائے لیکن قران نے نباہ نہ ہوسکنے کو بھی فسخ معاہدہ (طلاق) کی معقول اور جائز وجہ قرار دیا ہے۔ بہرحال، یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے جنسی اختلاط کے مواقع کو کم ازکم حد تک محدود کر دیا ہے۔ وہ زمانہ قبل از نکاح میں جنسی اختلاط کے کسی ایک موقع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا اور نکاح کے بعد عام حالات میں صرف ایک جوڑے کو باہمدگر وابستہ رکھتا ہے۔ تنوع (Change) کی خاطر تنوع (Change) کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن نے تو نکاح کی صورت میں بھی مُحْصِنِیْنَ کے ساتھ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ (۴/۲۴) کا اضافہ کیا ہے **حصن** کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور **سفح** کے معنی ہیں پانی وغیرہ کا بہا دینا۔ لہٰذا جہاں اس حکم میں زنا سے ممانعت مقصود ہے وہاں اس سے یہ بھی متصور ہے کہ نکاح کا مقصد بھی شہوت رانی نہیں۔ اس سے نکاح کی تمام ذمہ داریوں کی حفاظت اور بقائے نسل کا تحفظ مقصود ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ صرف وہی قوم زندگی کی کامرانیوں سے بہرہ یاب (مفلح) ہوسکتی ہے جو جنسی اختلاط کے مواقع کم ازکم حد تک لے جائے اور یہ کم ازکم مواقع بھی صرف معروف (Recognised) طریق سے مہیا کئے جائیں اور ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ:

> انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت ''مطلق وحدت زوج'' کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو جب عقد نکاح، مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا۔ تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم ازکم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کر لی تھیں جو زندگی بھر کی جبری

رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں۔ (اس لئے کہ اس وقت تک ''زندگی بھر کی جبری رفاقت'' تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی) اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا۔ وہی اقوام تہذیب وتمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ (ص۸۴)

☆☆☆☆☆☆☆

عربوں کی تاریخ :- ڈاکٹر انون نے اپنی تحقیق کے دوران ضمناً مسلمانوں (عربوں) کی تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا ہے کہ قدیم عرب، قبل از نکاح عصمت و پکارت پر زور نہیں دیا کرتے تھے۔ بعد میں (اسلام کی تعلیم کے ماتحت) انہوں نے اس عصمت پر شدت سے زور دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے محدود ملک سے نکل کر گردونواح کی دنیا پر پھیل گئے اس کے بعد جب انہوں نے اپنے حرم میں عورتوں کی بھرمار شروع کر دی تو ان کی فتوحات کی وسعتیں رک گئیں۔ (ص۴۲۹) اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ایک اور تاریخی عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت کیوں دی تھی۔ ڈاکٹر انون کے اس اصول کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ کسی قوم کی تمدنی تعمیر میں عورت کی محفوظ توانائی کا بہت بڑا اثر ہے بلکہ یہ کہ مردوں کی توانائی بھی اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جب ان کی عورتیں باعصمت ہوں۔ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جا کر رک گیا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں کی شادی کی۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کی مرتکز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں۔ یہی کچھ مصر میں ہوا اور یہی کچھ اسپین میں (ص۴۲۹) کسی کو ڈاکٹر انون کی تحقیق کے اس نتیجے سے اختلاف ہو یا اتفاق۔ لیکن یہ حقیقت بہرکیف اپنی جگہ پر غیر متنازعہ رہ جاتی ہے کہ اس محقق کے نزدیک کسی قوم کی فتوحات کی وسعتوں اور تہذیب کی بلندیوں پر اس کی عورتوں کی عصمت وضبط کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور یہی حقیقت قرآن نے بیان کی ہے جب اس نے زندگی کی کامرانیوں کے لئے مردوں اور عورتوں دونوں کے ''محصن'' (قلعہ بند) ہونے کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کا محصن ہونا جنسی اختلاط کے مواقع کم از کم درجے تک لے آتا ہے (یعنی زمانہ قبل از نکاح میں مطلق عصمت۔ نکاح میں وحدت زوج (Monogamy) بطور اساسی اصول اور نکاح کے بعد میاں اور بیوی کا کسی غیر عورت اور مرد کے ساتھ اختلاط ناجائز) لیکن جب کسی قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو جائیں

(جس کی شکل صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس ہنگامی ضرورت کے بغیر جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے' بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں۔ طلاق کی رخصت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ تبدیلی ازواج (۳) اور قرآن کے کھلے کھلے حکم کے خلاف لونڈیوں کی بھرمار سے سینکڑوں عورتوں سے اختلاط یہ سب جنسی اختلاط کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے کی شکلیں ہیں (تو پھر اس قوم میں نہ تو آگے بڑھنے کی توانائیاں رہ جاتی ہیں اور نہ ہی اپنے تمدن کو علیٰ حالہ قائم رکھنے کی صلاحیتیں باقی۔

جنسیات میں الجھی ہوئی قوم کی حالت :- اس قسم کی قوم زندگی کی کس سطح پر پہنچ جاتی ہے اس کے متعلق ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ :

> اس قوم میں علم وبصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی (۴)۔ وہ واقعات کے اسباب وعلل (Causes) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں)..... وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جوان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں.....اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز' گنڈہ تعویذ' اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ) اس قسم کے معتقدات' اس قوم میں نسلاً بعد نسل متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بالکل حیوان ہوتے ہیں (۵)۔ (ص ۳۴۶-۳۴۵)۔

آپ نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آ رہی اور کیا آج بھی

ساری دنیا میں ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سواحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا جسے قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہوگئیں۔ ان میں پھر یہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی اور یہی حالت اس وقت تک چلی جا رہی ہے۔ ان کے ممالک میں لونڈیاں آج تک سر بازار بکتی ہیں۔

ہمارا نوجوان طبقہ :- یہ تو ہے ہمارے اس طبقہ کی حالت جسے قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے نوجوانوں کا طبقہ ہے جنہوں نے مغرب کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنا' انفرادی آزادی کو مقید کرنا ہے۔ اس لئے ''ازمنہ مظلمہ'' کے ان اغلال وسلاسل کو جتنی جلدی توڑ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے چنانچہ انہوں نے عملاً اسے توڑنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان آزادیوں سے وہ سوسائٹی متشکل ہوتی ہے جس کے متعلق انون لکھتا ہے کہ اس میں:

> ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا جنسی کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے جنسی اختلاط قائم کرے۔ اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی کی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ لڑکے پر..... بچپن ہی سے وہ ہر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جن میں انہیں لذت ملتی ہو.....مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش ہوئی۔ اسے اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (ص ۳۴۸)۔

اس کا نتیجہ :- یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جا رہا ہے لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اسے خود ڈاکٹر انون کی زبان میں سن لیجئے وہ کہتا ہے کہ:

> لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم زندگی کی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتی رہے جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں لیکن انسانی ہیئت تو کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا جمع نہیں ہوسکتیں یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں جو ریفارمر ان میں مفاہمت(Compromise) کی کوشش کرتا ہے اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا

سالم باقی بھی بچ جائے کوئی انسانی معاشرہ ہو‘ اسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جاسکتی۔ (ص۴۱۲)

بنا بریں۔

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھائی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی (ص۴۱۴)۔

☆☆☆☆☆☆☆

پس چہ باید کرد:- آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کس طرح کی جائے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جایا جائے اور پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ جنسی واقع کی یہ شکل مستقل طور پر قائم رہ سکے تاکہ اس طرح وہ قوم انسانیت کی صلاحیت بخش توانائیوں کی حامل بنتی چلی جائے۔ ڈاکٹر انون نے اپنی کتاب کا خاتمہ اسی سوال (اور اس کے جواب) پر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

تاریخ کے صفحات پر کوئی سوسائٹی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کوشش میں کامیاب ہوگئی ہو کہ وہ جنسی اختلاط کے مواقع کو ایک مدت مدید تک‘ کم از کم حد تک محدود رکھ سکی ہو۔ میں تاریخی شواہد سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم نے ایسی صورت پیدا کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کرے۔ (ص۴۳۲-۴۳۱)

مرد اور عورت کی مساوی حیثیت:- آپ نے غور کیا کہ اس محقق کی تحقیق کے مطابق اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کی بنیادی شرط کیا ہے؟ یہ کہ اس میں مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا ہو! آج اس معاشرہ میں جس میں ہم صدیوں سے چلے آرہے ہیں یہ کہنا کہ اسلام نے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کیا تھا‘ شائد اپنی ہنسی اڑانے کے مترادف ہوگا۔ لیکن اس حقیقت کو کون چھپا سکتا ہے کہ قرآن نے یہ اعلان آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیا تھا کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۲۸) قاعدے اور قانون کی رو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنے ان کے فرائض ہیں۔ لہٰذا قانون کی نگاہ میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی درجہ حاصل ہے۔

لہٰذا ہمارے لئے تو کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اپنے معاشرے کوقرآنی خطوط پرمتشکل کرلیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

آخر میں ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ:

اگرکوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید تک' بلکہ ابد الاباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک' بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم ازکم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی وہ تمدن وتہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطہ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا (ص۴۳۲)۔

قرآن ایسے ہی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے نہایت واضح قوانین دیئے ہیں۔ وہ عائلی زندگی کو کس قدر اہمیت دیتا ہی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ جہاں صلوٰۃ وزکوٰۃ جیسے امور کے متعلق بالعموم اصولی قوانین دیتا ہے وہاں عائلی زندگی کے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے۔ اگر وقت ہوتا تو میں مسلسل خطبات کے ذریعے ان تمام احکام کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے لاتا جس سے آپ کو اندازہ ہوتا کہ قرآن کس قسم کے معاشرہ کا نقشہ دیتا ہے اور اس کے نزدیک جنسی تعلقات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ (اس کے متعلق اگر آپ تفصیل سے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب ''طاہرہ کے نام خطوط'' کا مجموعہ دیکھیے جس میں ان تمام امور کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے)۔

ایک بنیادی حقیقت:- لیکن اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کا آخر میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جنسی جذبہ بھی بھوک' پیاس' نیند وغیرہ کی طرح ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے اور جس طرح بھوک' پیاس وغیرہ کی اضطراری حالت میں عام قوانین کو ڈھیلا(Relax) کر دیا جاتا ہے اسی طرح جنسی قوانین کی بندشوں کو بھی ڈھیلا کر دینا چاہئے۔ یہ تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ(Natural Instinct) ہے لیکن اس میں اور بھوک

پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھئے۔ آپ کسی کام میں منہمک بیٹھے ہیں۔ آپ کو پیاس لگتی ہے شروع میں آپ کو اس کا خیال نہیں آتا وہ بڑھتی ہے تو آپ کو اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ پانی پی لیتے ہیں تو فبہا' ورنہ اس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ آپ کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اگر آپ کو کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے آپ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی بھی ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ

۱۔ بھوک' پیاس وغیرہ کا تقاضا ازخود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں آپ کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اور

۲۔ اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں- اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

خیال کا دخل :- لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تاوقتیکہ آپ اس کا خیال نہ کریں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمود یکسر آپ کے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر آپ کا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی ''اضطراری حالت'' کے لئے حرام کو حلال نہیں قرار دیا۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبط نفس سے کام لے۔ (۲۴/۳۳)

ضبط نفس :- اور یہ ضبط نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جس تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہو' اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے اپنے بس کی بات ہوتا ہے نہ خیالات کو طیور آوارہ بنائیے۔ نہ توجہ اس طرف جائے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ جس معاشرہ میں حالت یہ ہو جائے کہ

صید خود صیاد را گوید بگیر

اس میں ایک فرد (بالخصوص نوجوان طبقہ) اپنے خیالات پر کس طرح کنٹرول رکھ سکے؟ یہ بات ایک حد تک درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن چور ہی کو نہیں بلکہ چور کی ماں کو بھی مارتا ہے۔ وہ صرف ارتکاب جرم کے بعد مجرم کو نہیں پکڑتا بلکہ ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں ان جرائم کے ارتکاب کے مواقع کم از کم ہو جائیں۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (۶/۱۵۲) تم فواحش کے قریب تک نہ جاؤ۔ یعنی فواحش تو ایک طرف جو اسباب و ذرائع فواحش تک لے جانے والے ہوں ان سے بھی مجتنب رہو ان اسباب و

ذرائع میں وہ بھی شامل ہیں جو بظاہر نظر آ جاتے ہیں اور وہ بھی جو نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں یعنی دل میں گزرنے والے خیالات آہستہ آہستہ انسان کو فواحش تک لے جاتے ہیں اسی لئے اس نے کہا ہے کہ یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹) وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کی چوری (راز) تک سے واقف ہے۔ اس قسم کی روش کو تطہیر قلب و نگاہ کہتے ہیں یعنی دل اور آنکھ کی پاکیزگی۔ اس مقصد کے لئے قرآن مردوں اور عورتوں کے اختلاط (میل جول) کے متعلق تفصیلی ہدایات دیتا ہے (انہیں پردے کے احکام کہا جاتا ہے) مجھے افسوس ہے کہ اس کے لئے بھی وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ قرآن کس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں لاتا ہے جس میں عورتوں کی آزادی کو سلب نہیں کیا جاتا لیکن اس میں جنسی محرکات کبھی بے باک نہیں ہونے پاتے اور انسانی خیالات میں بے راہ روی نہیں پیدا ہوتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بہرحال آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مرد اور عورت کا جنسی اختلاط، محض ایک طبعی فعل (Biological Action) نہیں جس کا تعلق صرف انسان کے جسم تک ہو۔ اس کا تعلق قوموں کی تہذیب وتمدن اور کلچر اور ثقافت کے ساتھ بڑا گہرا اور بنیادی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے یونہی نظرانداز کر دیا جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم تمدن اور ثقافت میں ممتاز حیثیت حاصل کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جنسی تعلقات کو قرآن کی مقرر ردہ حدود کے اندر رکھیں۔ یعنی ان آزادیوں کو بھی محدود کریں جو مغرب کی اندھی تقلید سے ہمارے جدت پسند طبقہ میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں اور ان ''شرعی اجازتوں'' کو بھی حدود اللہ کا پابند بنائیں جو غلط (یعنی غیر قرآنی) مذہب کی بناء پر ہمارے قدامت پسند معاشرہ میں صدیوں سے مروج چلی آ رہی ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمارے ابھرنے اور آگے بڑھنے کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ سنت اللہ کسی کے لئے بدلا نہیں کرتی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

(طلوع اسلام فروری ۱۹۵۷ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆

حواشی

۱ واضح رہے کہ ان کا انداز، اس طریق سے مختلف ہے جو آج کل (بالخصوص) امریکہ میں رائج ہے اور جس کی رو سے ایک خاص خطہ یا طبقہ کے لوگوں کو سوالنامہ دیدیا جاتا ہے اور ان کے جوابات سے اعداد و شمار (Statistics) مہیا کر کے نتائج اخذ کر لئے جاتے ہیں اور ان نتائج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر اور فطرت انسانی کے ترجمان ہیں۔ آج کل امریکہ میں (Kinsley) کے قسم کے ''محقق'' اسی انداز سے جنسیات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ طریق کار

کبھی عالمگیر(Universal) نتائج بہم نہیں پہنچا سکتا۔

۲ اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ فرائڈ نے جنسیات کے متعلق اپنی تحقیق اور فکر میں جس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ان کے جو نقصان رساں نتائج مغربی معاشرہ میں نمودار ہوئے ہیں وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں ہم اس وقت صرف فرائڈ کے اس خیال سے بحث کر رہے ہیں کہ جنسی توانائی کو اگر بے باک نہ ہونے دیا جائے تو یہ اپنا رخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ لیتی ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۳ رابرٹ برفا(Briffault) نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی دقیع اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (The Mothers) اس میں وہ ایک گروہ کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر بیک وقت ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ (غالباً) چالیس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا یہ جنسی اختلاط کے متنوع مواقع کی ایک مثال ہے۔ اس سے اور مثالوں کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔

۴ دیکھئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ لہم قلوب لا یفقھم بھا ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔

۵ یہ بھی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (۱۲/ ۴۷) وہ سامان زیست سے اسی طرح فائدہ حاصل کرتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن

ن س خ

نسخ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا (ابن فارس)۔ **نسخت الشمس الظل۔** آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اس کی جگہ روشنی لے آیا۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ **نسخت الریح آثار الدیار۔** ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات وعلامات) کو تبدیل کر دیا (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انہیں ریت سے ڈھانک کر دگرگوں کر دیا)۔ **نسخ الکتاب۔** ایک کتاب کو نقل کر کے اس جیسی دوسری کتاب مرتب کر لینا۔ اسی سے **النسخۃ** منقول (Copied) کتاب کو کہتے ہیں (تاج۔ محیط وراغب)۔ قرآن کریم میں ہے **انا کنا نستنسخ** (۴۵/۲۹)۔ ''ہم لکھوا لیتے تھے''۔ مٹا دینے یا زائل کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۲/۵۲) میں آیا ہے۔ **فینسخ اللہ** ''اللہ مٹا دیتا ہے''۔

لہٰذا **نسخ** کے بنیادی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔ اس لفظ کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ چلا آ رہا ہے اور اسے دین کے مہمات میں سے سمجھا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم۔ اس لئے کہ اس کا غلط مفہوم دین کو اس کی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے اور اس کا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے۔

ناسخ ومنسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے) جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآن کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض ''ثواب'' کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض احکام قرآن کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے (مثلاً آیۂ رجم۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت)۔ اس

عقیدہ کی رو سے قرآن کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ:

(۱) قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے۔اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر تو نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ دوسری قسم کی آیات کے لئے تو دلیل صرف روایات کی ہے۔لیکن پہلی قسم کی آیات کے لئے خود قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے۔اور وہ آیت یہ ہے۔

ما ننسخ من آیة او ننسھانات بخیر منھا او مثلھا۔ الم تعلم ان اللہ علی کل شیئ قدیر (۲/۱۰۶)۔

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں۔کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا۔اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔اس لئے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔حتیٰ کہ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے۔

باقی رہا ''فراموش کرا دینے'' کا سوال۔سو اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسولؐ اللہ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے۔تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں۔ یہ مراد ہے **او ننسھا** سے۔اس کی دلیل میں یہ آیۃ پیش کی جاتی ہے۔ **سنقرئک فلا تنسیٰ الا ماشاء اللہ**..... (۸۷/۶۔۷) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا' ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا' قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ قرآن کریم کے اس حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔

قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اس کی ناسخ۔

اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ تصور کہ حضورؐ خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے۔ یاللعجب!

ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم آگے آئے گا۔ **سنقرئک فلا تنسیٰ** کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ن۔س۔ی دیکھئے جہاں اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔

اب دیکھئے اس آیت (**ما ننسخ.....**) کا صحیح مفہوم۔ پیچھے سے سلسلۂ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہؐ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے)۔ اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسےٰؑ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دیئے تھے، اور وہ احکام توریت وغیرہ میں موجود ہیں۔ تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی؟ اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔

ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت حضرت نوحؑ کے زمانے سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف وہ احکام بھیجے جاتے تھے اور انہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں، جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آ جاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا۔ اس طرح یہ جدید وحی اس سابقہ وحی کی قائم مقام (ناسخ) بن جاتی۔ یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ توریت کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسےٰؑ نے آ کر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اس کی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دیئے جاتے تھے۔ ان کی سطح سے بلند احکام و قوانین روک لئے جاتے تھے۔ تا آنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی۔ تو وہ ''روکے

ہوئے'' احکام وقوانین اس وقت نازل کر دیئے جاتے۔ تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے۔

نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد' اس کی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی۔ بعض کو فراموش کر دیتی۔ اس لئے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر وتبدل کی ضرورت نہ ہوتی) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے ازسرنو تازہ کر دیا جاتا۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے۔ اب وہ دور آ گیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کر لے گا۔ لہٰذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ۔

(۱) سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو ان کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کر کے ان کی جگہ' دوسرے احکام و قوانین بھیج دیئے جائیں اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہو رہا ہے اس لئے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہوں گے۔ اس لئے یہ احکام وقوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے۔

(۲) وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ ہنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے' اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے' کیونکہ قرآن کریم انسانیت کی بلندترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا۔

(۳) اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام وقوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا۔ یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کر دی گئی ہے (ان کی مثل احکام دے دیئے گئے ہیں)۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے ایک نئے رسول اور نئی کتاب کو بھیجا گیا ہے اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اسی قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں۔ **فان امنوا بمثل ما امنتم به فقد اهتدوا و ان تولوا فانما هم فی شقاق** (۲/۱۳۷)۔ اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پا سکیں گے اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے۔

یہ ہے صحیح مفہوم **ما ننسخ من آية او ننسها نات بخير منها او مثلها** کا۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں۔

نسخ کے معنی ہم نے اوپر دیکھ ہی لئے ہیں۔ کسی چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا۔ آیت کے معنی صرف قرآن کریم کی آیات نہیں۔ قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیات اللہ کہا ہے۔ مثلاً اسی سورۃ بقرہ میں قصۂ

آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا۔ **فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** (۲/۳۸)۔ جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کرے گا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا اور اس سے آگے ہے۔ **والذین کفروا او کذبوا بایتنا** ..... (۲/۳۹) ان کے برعکس، جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کریں گے اور ان سے انکار کریں گے..... یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا **ماننسخ من آیة** میں آیات سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات سے۔ جیسا کہ سورۃ نحل میں کہا گیا ہے۔ **واذا بدلنا آیة مکان آیة** ۔ (۱۶/۱۰۱)۔ ''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں''۔

اس کے بعد لفظ **ننسھا** ہے۔ یہ لفظ **نسی** سے ہے۔ **نسی** کے معنی کسی چیز کو ترک کر دینا، یا فراموش کر دینا، آتے ہیں۔ (دیکھئے عنوان ن۔س۔ی)۔ اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آ جاتی ہے کہ سابقہ کتب آسمانی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا۔ لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سر نو محکم کر دیتا (۲۲/۵۲)۔ یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کر دیتے تھے۔ اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کر دیتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت۔

نسی کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اس اعتبار سے آیت **ننسھا** سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے، انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے۔

اس اعتبار سے قرآن کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مھیمن ہے (۵/۴۸)۔ یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہو گئے ہیں اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لئے دینے تھے، ان سب کی تکمیل ہوگئی ہے۔ **وتمت کلمت ربک صدقا و عدلا** (۶/۱۱۶)۔ نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ انسانوں میں سے کوئی اس میں ردوبدل کر سکے گا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے

لے رکھا ہے(۹/۱۵)۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے وحی کے سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا۔ تو اس کا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ **ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر** (۲/۱۰۶)۔ خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جائے۔ یہ سب کچھ ان اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اسے پوری پوری مقدرت حاصل ہے۔

یہ ہے ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے۔ البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ جب حالات بدل جائیں تو اس کی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ کے لئے وضو کا حکم ہے۔ لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمّم کا حکم ہے (۵/۶)۔ ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمّم کا حکم آگے آ جائے گا۔ جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آگے آ جائے گا اور تیمّم کا حکم پیچھے چلا جائے گا۔

یا مثلاً قرآن کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لئے سزا مقرر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآن کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس، محتاج، گداگر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو ''ناسخ و منسوخ'' سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ''منسوخ'' اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہو سکے۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں۔

ما ننسخ والی آیت (۲/۱۰۶)۔ یا سورۃ النحل کی آیت **اذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ** (۱۶/۱۰۱) میں اگر آیۃ سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لئے جائیں (جنہیں قرآن کریم متعدد مقامات پر ''آیات اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے) تو ''نسخ آیت'' سے مراد ہو گا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آ جانا۔ ارباب علم و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کس طرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق و

سباق کا تعلق وحی سے ہے اس لئے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں' اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اول الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر' یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو۔ اس غیر متبدل صحیفۂ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا۔ **واللہ علیٰ ما نقول شھید۔**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟

قرآن نہیں کہتا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھا لئے گئے تھے۔ سورہ آلِ عمران کی آیت ۵۵ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور انہیں منکرین کے طعنوں سے پاک کرنے اور ان کے درجات بلند کرنے کا وعدہ ہے۔ ''انی متوفیک و رافعک الی و مطھرک من الذین کفروا''۔ سورہ النساء کی آیات ۱۵۷۔۱۵۸ میں عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور صلیب سے بچائے جانے کا بیان اور ان کے درجات بلند کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے وعدے کی تکمیل کا ذکر ہے۔ ''وما قتلوہ وما صلبوہ۔ بل رفعہ اللہ الیہ۔'' سورہ المائدہ کی آیت ۱۱۷ میں ہے کہ یوم قیامت عیسیٰ علیہ السلام اپنے متبعین کے متعلق بارگاہ رب العزت میں عرض کریں گے کہ جب تک میں ان میں یا ان کا نگران رہا (کہ وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں) لیکن جب تو نے مجھے وفات دے دی تو میری نگرانی ختم ہو گئی اس کے بعد تو ہی ان کا نگران تھا۔ ''وکنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم۔ فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علی کل شئی شھید''۔ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۴۴ میں ہے کہ رسول کریم سے پہلے سب انبیاء علیہم السلام فوت ہو چکے۔ سورہ الانبیاء کی آیت ۳۴ میں ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے کسی کو دوام نہیں بخشا گیا ''وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد افائن مت فھم الخدون''۔ سورہ الانعام میں ہے کہ تم خدا کے قانون میں تبدیلی نہیں پاؤ گے اور نہ ہی کوئی اس کے قانون کو بدل سکتا ہے۔ جسمِ انسانی کا آسمان کی طرف اٹھائے جانا اللہ کا قانون فطرت نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن کی رو سے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھایا ہی نہیں گیا تو قربِ قیامت میں ان کے نزول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے اور جب کسی بات یا واقعہ کا ذکر قرآن میں نہ ہو تو ہمارے روایتی علماء کے فرمان کی رو سے اس پر ایمان لانا کس طرح فرض قرار پا سکتا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کے لئے گن کر پانچ چیزیں متعین کر رکھی ہیں (القرآن ۲/۱۷۷)۔ اللہ۔ یوم

آخرت۔ ملائکہ۔ کتب سماوی اور انبیائے کرام۔

عیسائیوں کے ایک گروہ کی مذہبی پیشوائیت نے انجیل برنباس میں یسوع کو تیسرے آسمان پر بٹھا رکھا ہے۔ ان کے اتباع میں ہمارے احبار و رہبان نے تھوڑے فرق کے ساتھ وضعی روایات کی رو سے عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرے آسمان پر براجمان کر رکھا ہے۔ موجودہ زمانے کی علمی سطح کے مطابق سائنس کے انکشافات کی رو سے نیلگوں فضا کو من گھڑت روایات کے مطابق شیشے کے ڈل کی مانند آسمان کو تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ اگر بفرض محال مان لیا جائے کہ مسیح علیہ السلام سیٹلائیٹ کی طرح اوپر کسی جگہ Space میں بیٹھے ہیں تو آپ وہاں نماز تو پڑھ لیتے ہوں گے زکوٰۃ کا فریضہ کیسے ادا کرتے ہوں گے؟ جب کہ سورہ مریم میں اللہ کے برگزیدہ نبی عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جب تک زندہ رہوں نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا رہوں'' ''واوصنی بالصلوٰۃ و الزکوٰۃ مادمت حیا۔''

ہمارے فتویٰ گر مولویوں کا اصرار ہے کہ مسلمانوں میں روایات کی رو سے یہ عقیدہ تواتر سے چلا آ رہا ہے اس لئے یہ درست اور فرض ہے اور اس کا نہ ماننے والا منکرِ حدیث یا کافر ہے لہٰذا یہ کہہ کر اَن پڑھ لوگوں کو مشتعل کرتے رہتے ہیں۔ (تواتر کا عقیدہ بھی غلط ہے۔ ابنِ حزم علیہ الرحمہ نے اس کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ ہمارے قریب کے زمانے میں علامہ اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا عبیداللہ سندھی علیہم الرحمہ وغیرہ نے کھل کر اس سے اختلاف کیا ہے۔ اس ضمن میں جتنی بھی احادیث ہیں وہ صحیح نہیں ہیں بلکہ صحت کے درجہ سے گری ہوئی ہیں دیکھئے ''احادیث دجال کا مطالعہ'' از شبیر از ہر' تلمیذ حسین احمد مدنی۔ ''انتظارِ مہدی و مسیح'' از محدث العصر تمنا عمادی۔)

یہ عقیدہ مسلمان قوم کو بے عمل بنانے کی ایک گہری سازش ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے منتظرِ فردا رہیں کہ کوئی آنے والا آئے گا اور ان کی حالت سنوار دے گا۔ ہم نہیں سوچتے کہ ہمارے آباؤ اجداد جو اس عقیدہ کے ساتھ وفات پا گئے انہیں اس کا کیا فائدہ ہوا؟ اور جب ہم اور یہ حضرات موجودہ حالت میں وفات پا جائیں گے تو ہمیں اس عقیدہ کے عوض کیا ملے گا؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اس لئے اس کے الفاظ اور اصطلاحات کو تو کوئی بدل نہیں سکتا۔ ہمارے مترجمین اور مفسرین نے دورِ عباسیہ کی ملوکیت کے زیرِ اثر وضعی روایات کی رو سے اپنے معاشی مفاد کی خاطر قوم میں الجھاؤ پیدا کر کے اسے غلط پٹڑی پر ڈالنے کے لئے قرآنی الفاظ کی ایسی معنوی تحریف کر رکھی ہے جو عام طور پر نظر ہی نہیں آتی۔ مثال کے طور پر سورہ المائدہ کی آیت ۱۱۷ پر غور کیجئے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کی طرف سے الفاظ ''فلما توفیتنی'' آئے ہیں۔قرآن کی کوئی بھی باترجمہ اردو جلد اٹھا کر دیکھئے طبری اور ابنِ کثیر کے اتباع میں اس کا ترجمہ ملے گا ''جب قبض کیا تو نے مجھ کو''۔ اس ترجمہ سے کوئی کیا سمجھے۔ پکتھال نے انگلش میں اس کا ترجمہ When Thou tookest me کیا ہے۔جس سے بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ ہمارے ہاں پنجابی اردو میں گالی کے طور پر کہا جاتا ہے تینوں اللہ لوے یعنی اللہ تجھے موت دیوے۔ یوسف علی نے انگلش میں ترجمہ when Thou didst take me up کیا ہے جبکہ آیت کریمہ میں اوپر کے لئے لفظ علیٰ نہیں ہے۔ توفیتنی لفظ کا مادہ **وف ی** ہے اور اسی سے لفظ الوفاء ہے جس کے معنی ہیں وعدہ پورا ہونا اور الوفاۃ کے معنی ہیں موت' یعنی دنیا میں زندگی کے دن پورے کر لینا۔ توفاہ اللہ کے معنی ہیں اللہ نے اسے وفات دے دی۔ وفات کے معنوں میں سورہ انعام میں ہے ''حتی اذا جاء احد کم الموت توفتہ رسلنا'' یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اسے وفات دے دیتے ہیں۔اسی مادہ سے لفظ متوف کے معنی ہیں وفات دینے والا۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہتے ہیں انی متوفیک۔ ہم تمہیں وفات دیں گے یعنی اسی دنیا میں تمہارے دن پورے کرائیں گے۔ سورہ المائدہ کی آیت ۱۱۷ سے یہی مطلب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے کہا جائے گا کہ جب تک میں ان میں رہا تو میں ان کا نگران رہا لیکن جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تو ہی ان کا نگران تھا۔

عیسائیوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کے کفارہ (Atonement) پر بھی ایمان لانے کا عقیدہ پایا جاتا تھا یعنی The act of Christ in expiating the sins of man کا عقیدہ۔ عیسائیوں نے یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر جان دی تھی اس لئے وضع کیا کہ ان کے کفارہ کے عقیدہ کا اثبات ہو جائے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے بیٹے نے اپنی جان دے کر ہمیں گناہوں سے نجات دلا دی۔ عیسائیت کی ساری تعلیم اسی مرکز کے گرد گھومتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عیسائی کی موت کے وقت پادری آ کر اس سے حضرت مسیح کی وفات کے کفارہ کے عقیدہ کا اقرار لیتا ہے۔قرآن کریم نے آیات ۱۵۸۔۴/۱۵۷ کے تسلسل میں ان کے اس عقیدہ کی تردید کر دی وان من اھل الکتب الا لیومنن بہ قبل موتہ و یوم القیمۃ یکون علیھم شھیدا (۴/۱۵۹)۔ عیسائیوں کا یہ عالم کہ باوجود یکہ حقیقتِ حال کا انہیں بھی یقینی طور پر علم نہیں۔ وہ مسیحؑ کے جان دینے اور اس طرح ان کے گناہوں کے کفارہ بن جانے پر ایسا محکم یقین رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی موت کے وقت اس کا اقرار کرتا ہے لیکن جب یہ لوگ مسیحؑ کے کفارہ

پر ایمان کی بنا پر اپنی بخشش کے لئے خدا کے حضور جائیں گے تو خود مسیحؑ ان کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے ان سے اس قسم کے عقائد رکھنے کا کبھی نہیں کہا تھا۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دی ہی نہیں گئی تھی عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کی بنیاد ختم کر دی۔

قرآن کریم کے اس اعلان کے خلاف ہمارے مفتیانِ کرام فرماتے ہیں کہ اکثر مفسرین نے آیت قرآنی وان من اھل الکتب الا لیومنن بہ قبل موتہ ویوم قلھمۃ یکون علیھم شھیدا میں (قبل موتہ) کی ضمیر کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع قرار دے کر اس سے نزولِ عیسیٰ علیہ السلام مراد لیا ہے۔ (حالانکہ یہ بھی ڈھکوسلا ہے۔ اشرف علی تھانوی علیہ الرحمتہ کے ترجمۂ قرآن اور تفسیر میں قبل موتہ کی ضمیر کو حضرت عیسیٰ کی طرف راجع قرار نہیں دیا گیا۔ دیکھئے بیان القرآن۔) یعنی اپنے خود ساختہ عقیدہ کے اثبات کی خاطر آیت کریمہ کی معنوی تحریف کر کے مراد لیا ہے۔ جس کا قرآن میں ذکر تک نہیں۔ سچ کہا تھا علامہ اقبالؒ نے کہ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں۔ ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق۔ یاللعجب۔ اس کا نزول مراد لیا ہے جسے آسمان پر لے جایا ہی نہیں گیا۔ ۱۹۶۲ء میں ہمارے ساتھ ہالینڈ سے آئی ہوئی کیمونسٹ مسلک کی عورت کام کرتی تھی میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ خدا کو مانتی ہیں جواب ملا ہاں! میں نے کہا خدا کہاں ہے کہنے لگی ہر جگہ۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا کیونکہ ہم مسلمانوں نے اپنے تصوراتی خدا کو بہت دور عرش پر بٹھا رکھا ہے ایضاً۔ خدا کے متعلق قرآن کے پیش کردہ تصور کی رو سے ورافعک الی اور بل رفعہ اللہ الیہ میں الی سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی خاص مقام میں متمکن ہے جس کی طرف اس نے حضرت عیسیٰ کو اٹھا لیا تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے بابل سے فلسطین ہجرت کی تو فرمایا انی مہاجر الی ربی۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہجرت کر کے آسمان کی طرف تشریف نہیں لے گئے تھے۔ باقی رہا لفظ رفع تو اس کے معنے بلندی مدارج ہیں۔ مثلاً نرفع درجٰت من نشاء ہم اپنی مشیت کے مطابق بلندی درجات عطا کر دیتے ہیں۔ ورفعنا لک ذکرک ہم نے تیرے ذکر کو بلند کر دیا۔ حضرت ادریسؑ کے متعلق تو رفعت کے ساتھ مکان کا لفظ بھی آیا ہے جہاں کہا گیا ہے ورفعنہ مکانا علیا۔ ہم نے اسے نہایت بلند مقام عطا کر دیا۔ بلندی درجات عطا کرنے کی جہت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو رفیع الدرجات کہا ہے یعنی بلند مدارج عطا کرنے والا۔ ان تصریحات کی رو سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو کہا ہے کہ ورافعک الی اور بل رفعہ اللہ الیہ تو اس سے مراد یہ نہیں کہ خدا انہیں اٹھا کر اپنی طرف (آسمان پر لے گیا) اس کے معنی نہایت واضح ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور سرمدؔی، راولپنڈی
mansoor_sarmadi@yahoo.com

شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرھا (۲)

(فکرِ غامدی پہ اِک نظر)

[نوٹ: ربطِ مضمون کے لیے گذشتہ ماہ کا شمارہ ملاحظہ کیجئے]

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگذر؟

جہاد

آج اگر یورپ کی مہذب اقوام کے کسی فرد کے سامنے ''جہاد'' یا ''اسلام'' کا ذکر کر دیا جائے تو اس کی آنکھوں کے سامنے کچھ اس قسم کا منظر آ جاتا ہے جیسے ہزاروں وحشی خونخوار جنگجوؤں کے غول در غول ایک ہاتھ میں تلوار، دوسرے میں لگا میں پکڑے منہ سے ''اللہ اکبر'' کے فلک شگاف نعرے لگاتے اپنے گھوڑوں کو سر پٹ دوڑاتے ہوئے دیوانہ وار چلے آ رہے ہیں۔ یہ بلائے ناگہانی جہاں جہاں سے گذرتی جاتی ہے، صدیوں کی عرق ریزی سے تیار کردہ تہذیب وتمدن کی فلک بوس عمارتیں اور علم وادب کے شاہپارے ایک ایک کر کے منہدم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لائبریروں اور رصدگاہوں سے دھواں اٹھتا دکھائی دیتا ہے اور انسانیت ہر طرف نوحہ کناں نظر آتی ہے۔ نہ برہمن کو کہیں اماں نصیب ہے اور نہ کلیسا کے کسی راہب کو، چاروں طرف اعضائے انسانی، خون اور آگ کے شعلے دکھائی دیتے ہیں۔

جب ذرا یہ شورِ قیامت تھمتا ہے تو غنیم کے مرد، عورتیں اور بچے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور ناکوں میں نکیل ڈلوائے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ ''نخاس'' کے

بازاروں کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں۔ جہاں پر انسانیت ٹکے ٹکے کے بدلے بک رہی ہے۔ مردوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جاتا ہے اور بے بس عورتیں بلا نکاح ان ''مجاہدین اسلام'' کے بستر گرمانے پر مامور کر دی جاتی ہیں..... (ماخوذ)۔ یہ ہے جہاد اور اسلام کی وہ تصویر جو پچھلی کئی صدیوں سے کسی غیر نے نہیں بلکہ ہمارے ملا نے مغرب سمیت پوری دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ جسے دیکھتے ہی مہذب انسانوں کی بھنویں تن جاتی اور آنکھوں میں ساری نفرت سمٹ آتی ہے۔ یہ تصویر جب مستشرقین کے ہاتھ لگی تو انہوں نے اسے حتی المقدور شدید اعتراضات کا تختۂ مشق بنایا۔ ان اعتراضات کے ردعمل میں ہمارے احبار و رہبان نے کبھی تو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لیا' چنانچہ ایک مدعیِ نبوت نے تو جہاد کا بالکلیہ انکار کر ڈالا اور ببانگ دہل کہہ دیا۔ ؎

اے دوستو جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

اور کبھی انہوں نے اسلام اور جہاد کے حق میں ایسے پوچ دلائل دیئے جو ''ریچھ کی دوستی'' کی طرح خود اسلام کے حق میں انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئے۔ چنانچہ ایک ''مزاج شناسِ رسول'' نے مستشرقین کے اس اعتراض کہ اسلام اپنی حقانیت کے بل پر نہیں بلکہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے کے جواب میں یہ لکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کفار مکہ کو تیرہ سال تبلیغ کی' فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے' کبھی زورِ خطابت کا جادو جگایا اور کبھی معجزات کی اثر آفرینی سے کام لیا مگر:

''اس کے باوجود صرف یہ چیز انہیں اس راہ کو اختیار کرنے سے روک رہی تھی کہ ان لذتوں کا چھوڑنا انہیں گوارا نہ تھا جو کافرانہ بے قیدی کی زندگی میں انہیں حاصل تھیں۔ لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی اور الا کل ماثرہ او دم او مال ید عی فھو تحت قدمی ہاتین کا اعلان کر کے تمام موروثی امتیازات کا خاتمہ کر دیا۔ عزت و افتخار کے تمام رسمی بتوں کو توڑ دیا.....عرب کے دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سرعت کے ساتھ قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہوگئی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے..... پس جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے''۔

(الجہاد فی الاسلام۔ از ابوالاعلیٰ مودودی۔ ص ۱۷۵۔۱۷۳)۔

یہ ہے ان لوگوں کا اسلام پر اعتراضات کا دفاع کرنے کا انداز جس کے بعد یقیناً اسلام پکار اٹھتا ہوگا کہ ؎

خدا مجھے میرے دوستوں سے بچائے

اسلام کے نظریہ قتال و جہاد پر مستشرقین کا سب سے بڑا اعتراض ایک مستشرق کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے تاکہ اعتراض کے ساتھ ساتھ لہجے کی تلخی بھی محسوس ہو سکے۔ مسٹر باس ورتھ سمتھ (Boswarth Smith) نے برطانیہ کے رائل انسٹی ٹیوٹ میں فروری اور مارچ ۱۸۷۴ء میں لیکچر دیتے ہوئے کہا:

The free toleration of the purer among the creeds around him, which the prophet had at first enjoined, gradually changes into intolerance. Persecuted no longer Mohammed becomes a persecutor himself, with the Koran in one hand, the scymitar in the other, he goes forth to offer to the nations the threefold alternatives of conversion, tribute, death.

(Mohammed and Mohamedanism, Page 137)

ترجمہ: آنجناب (ﷺ) کے چہار سو پھیلے ہوئے مذاہب میں سے خالص تر مذہب (اسلام) کی وہ کھلی رواداری جس کی پیغمبر اسلام نے اول اول تاکید کی تھی۔ اب رفتہ رفتہ عدم برداشت میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ اب محمد (ﷺ) کو ایذا نہیں پہنچائی جاتی بلکہ وہ خود اب دوسروں کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر آنجناب مختلف قوموں کے پاس جاتے ہیں اور انہیں تین باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی پیشکش کرتے ہیں۔ یعنی اسلام قبول کرلیں یا جزیہ ادا کریں یا پھر موت کا سامنا کر لیں۔

(باس ورتھ سمتھ' محمد و دین محمدی' دوسرا ایڈیشن' ص ۱۳۷)

انہی سے ملتے جلتے الفاظ میں علامہ جاوید احمد صاحب غامدی نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایک مضمون پر نقد کرتے ہوئے اسلام میں تلوار یا تبلیغ کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

''سیرت نبوی کی لازوال ہدایت اور پیغمبر ﷺ کا دائمی اسوہ یہ ہے کہ دعوت اور صرف دعوت کے ذریعے سے مسلمانوں کو اپنا ہم نوا بنا کر ان کی آزادانہ مرضی اور ان کی رائے اور مشورے سے' پہلے اسے (یعنی انقلاب کو' م۔س) امت میں برپا کیا جائے اور پھر اگر ضرورت ہو تو جہاد و قتال کے ذریعے سے یہ امت اپنے فرماں رواؤں کی قیادت میں بالکل اسی طرح پوری دنیا میں اس کی

توسیع کے لئے نکل کھڑی ہو' جس طرح رسالت مآب ﷺ کے بعد صحابہ کرام' خلفائے راشدین کی قیادت میں روم و ایران کی بادشاہتوں میں اس کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے' اور انہوں نے ان کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر کہا تھا: اسلام لاؤ' جزیہ دو یا لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ''۔

(ماہنامہ اشراق' فروری ۱۹۹۳ء' ص ۱۴-۱۳)

دیکھ لیجئے معاندین کی طرف سے کئے گئے اعتراضات کا مدلل رد کرنے کے بجائے خم ٹھونک کر ان کا اعتراف و اقبال کیا جا رہا ہے۔ جس دین کو اس قسم کے شارحین نصیب ہو جائیں اسے پھر کسی دشمن کی احتیاج کیا ہو گی۔ ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

یہ کچھ موصوف نے ۱۹۹۳ء میں فرمایا تھا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان پر اپنے موقف کی فروما ئیگی واضح ہوتی چلی گئی' چنانچہ جب انہوں نے مذکورہ مضمون اپنی کتاب 'برہان' میں شامل کیا تو محولہ بالا سطور پر یوں حاشیہ آرائی فرمائی:

''اس مضمون کی تسوید کے وقت میرا یہی نقطہ نظر تھا لیکن بعد کی تحقیق سے واضح ہوا کہ اس جہاد کا تعلق قرآن کے قانون اتمام حجت سے ہے اور یہ صحابہ کرامؓ کے ساتھ ہی خاص تھا۔ چنانچہ ان کے بعد اب قیامت تک یہ حق کسی شخص کو بھی حاصل نہیں رہا کہ وہ اسلام لاؤ' جزیہ دو یا لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ کی دعوت کے ساتھ دنیا کی قوموں پر حملہ آور ہو جائے۔''

(برہان' طبع چہارم ۲۰۰۶ء' ص ۲۰۷ فٹ نوٹ)

چلئے' ایک مشکل کام سے امت مسلمہ کی جان چھوٹ گئی۔ رسول اللہ نے جو جہاد و قتال کیا وہ بقول غامدی صاحب' کفار مکہ پر اور اہل کتاب پر عذاب خداوندی تھا (میزان' طبع دوم ۲۰۰۲ء' ص ۲۶۵' ۲۷۰) اور اللہ کے قانون اتمام حجت کا حصہ تھا۔ اس کا تعلق شریعت سے نہیں ہے۔ (ایضاً ص ۲۶۴)' رہا صحابہ کرامؓ کا روم و ایران کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر تلوار سونت کر جزیہ' اسلام' یا موت کے آپشنز (Options) دینا تو موصوف کے ارشادات کے مطابق یہ دراصل فریضہ شہادت علی الناس تھا۔ (میزان' ص ۲۰۱) یہ صحابہ کا منصب تھا' نبوت جس طرح نبی (ﷺ) پر ختم ہو گئی۔ اسی طرح شہادت کا یہ منصب اور اس کے ساتھ منکرین حق سے قتال اور ان پر جزیہ عائد کرنے کا یہ حق بھی ان نفوس قدسیہ پر ختم ہوا (ایضاً ص ۲۰۳)۔ امت مسلمہ کو موصوف کا ممنون احسان ہونا چاہئے جنہوں نے اس قتل و غارت گری اور خون خرابے کے الزام سے ان کو نجات دلا دی۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

ضمناً' یہاں پر غامدی صاحب کی ایک علمی ''دیانت'' کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے تا کہ خوانندگان محترم کو کچھ تو اندازہ ہو سکے کہ دین کی تفہیم وتشریح اب کس قسم کے شہ دماغوں کے ہاتھ آ چکی ہے۔ بات یوں ہوئی کہ موصوف نے نوائے وقت کے صفحات میں ڈاکٹر اسرار صاحب کے نظریہ ''نبوی انقلاب'' پر نقد و جرح کی' جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ یہ بحث بعد میں اشراق ۱۹۹۳ء کے فروری کے شمارہ میں بھی شائع ہوئی۔ سلسلہ مراسلت میں جہاد کے متعلق غامدی صاحب نے تحدی آمیز (Challenge) انداز میں اپنا حتمی نقطہ نظر ان الفاظ میں بیان کیا:

''جہاد بالسیف ہماری تحقیق کے مطابق' قرآن و حدیث کی رو سے پانچ ہی صورتوں میں ہو سکتا ہے۔

۱۔ مملکت کے دفاع کی غرض سے۔

۲۔ مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لئے۔

۳۔ باغیوں کی سرکوبی کے لئے۔

۴۔ رسول کی ہجرت کے بعد اس کی قوم کے خلاف عذاب الٰہی کے طور پر۔

۵۔ غلبۂ دین کے لئے۔

ان میں سے پہلی' دوسری اور تیسری قسم اس وقت موضوع بحث نہیں ہے۔ چوتھی صورت ختم نبوت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ رہی پانچویں صورت تو اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک اپنی حکومت کے خلاف۔ دوسری' دنیا کی دوسری حکومتوں کے خلاف..... یہ اس جہاد کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر ہے۔''

(اشراق' فروری ۱۹۹۳ء' ص ۶۲۔۶۱)

جو لوگ بات کہہ یا لکھ چکنے کے بعد اس پر غور و فکر شروع کیا کرتے ہیں' وہ تضاد بیانی سے کم ہی بچ پاتے ہیں۔ مندرجہ بالا مضمون کو جب موصوف نے اپنی کتاب ''برہان'' میں درج کیا تو اپنا ''جہادی'' موقف یوں تبدیل کر لیا:

''جہاد بالسیف' ہماری تحقیق کے مطابق قرآن مجید کی رو سے دو ہی صورتوں میں ہو سکتا ہے۔

۱۔ ظلم وعدوان کے خلاف۔

۲۔ اتمام حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف۔

ان میں سے پہلی صورت اس وقت موضوع بحث نہیں ہے' رہی دوسری صورت تو جہاد کے عام شرائط کے علاوہ خاص اس جہاد کے لئے جو دو لازمی شرائط قرآن مجید سے ثابت ہیں۔ اب وہ بھی سن لیجئے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ یہ صرف کافروں کے خلاف ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی کسی جماعت' کسی حکومت' کسی مملکت اور کسی ریاست کے خلاف اس جہاد کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہے..... دوسری

شرط یہ ہے کہ کافروں کے خلاف بھی اس جہاد کا حق مسلمانوں کو اس وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ خلافت علی منہاج النبوۃ کا نظام اس امت میں پوری امت کی سطح پر قائم کر دیں..... یہ اس جہاد کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر ہے۔''

(برہان از غامدی۔طبع چہارم' جون ۲۰۰۶ء۔ص ۲۴۶۔۲۴۵)

موصوف کی چابک دستی دیکھ کر ہمیں ان کے ممدوح جناب مودودی کی ایک ٹیکنیک یاد آ گئی۔ ہوا یوں کہ ۶۱۔۱۹۶۰ء کے آخری مہینوں کے ترجمان القرآن میں شائع ہوئی بحث اختتام تک پہنچتے پہنچتے بدقسمتی سے مناظرانہ رنگ اختیار کر گئی۔ ڈاکٹر سید عبدالودود نے اس سلسلے کا آخری خط جنوری ۱۹۶۱ء میں مودودی صاحب کو ارسال کر دیا۔ یہ خط نہایت مدلل اور خود مکتفی تھا اور ترجمان القرآن میں شائع کردہ' مودودی صاحب کے گذشتہ خط میں کئے گئے تمام اعتراضات کا جواب اس میں موجود تھا۔لیکن' مودودی صاحب' ڈاکٹر صاحب کے مدلل خط کا جواب الجواب جنوری تا اگست ۱۹۶۱ء نہ دے سکے۔مودودی صاحب نے ڈاکٹر موصوف کا خط ترجمان القرآن میں شائع نہ کیا اور لیت ولعل سے کام لیتے رہے۔ اپریل ۱۹۶۱ء میں تنگ آ کر ڈاکٹر صاحب نے وہ خط' چٹان اور طلوع اسلام' میں شائع کروا دیا۔اس پر مجبوراً مودودی صاحب نے ایک صبر آزما انتظار کے بعد پچھلی ساری خط و کتابت سمیت ڈاکٹر صاحب کا مذکورہ خط اور اس پر اپنا مفصل تبصرہ ستمبر ۱۹۶۱ء میں ترجمان القرآن کے خصوصی ایڈیشن ''منصب رسالت نمبر'' میں شائع کر دیا۔ یہ کتاب بڑے پیمانے پر مقبول ہوئی مگر اس میں چونکہ ڈاکٹر صاحب کے دلائل زیادہ وزنی تھے اس لئے جلد ہی اس کتاب کی ترسیل و اشاعت روک دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کا مبسوط و مربوط خط کمال درجے کی قطع و برید کے بعد مختصر بے ربط سوالات کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا اور ہر سوال کے بعد مودودی صاحب کا تفصیلی جواب لکھ کر صرف دو سال بعد اگست ۱۹۶۳ء میں وہی ''منصب رسالت نمبر'' اب نام کی تبدیلی کے بعد ''سنت کی آئینی حیثیت'' کے نام سے شائع کر دیا گیا۔منصب رسالت نمبر' پڑھ کر قاری کا تاثر اس تاثر سے بالکل مختلف بنتا ہے جو سنت کی آئینی حیثیت پڑھ کر قائم ہوتا ہے' اور یہی اس ٹیکنیک کا مقصد تھا۔

غامدی صاحب نے محولہ بالا مقالہ ڈاکٹر اسرار صاحب کے نقطۂ نظر کے رد میں نہایت قطعیت کے ساتھ مناظرانہ انداز میں ۱۹۹۳ء میں تحریر کیا تھا۔ دیانت داری کا تقاضا یہ تھا کہ جب اس مقالے کو کتابی شکل میں درج کیا جائے تو من عن درج کیا جائے۔ اگر غامدی صاحب کو اپنے سابقہ موقف کی بے مائیگی کا احساس ہو ہی گیا تھا تو اسے فٹ نوٹ (حاشیہ) میں درج کیا جانا چاہئے تھا۔لیکن موصوف نے چپکے سے اپنی ہی اصل عبارت میں قطع و برید کر کے ثابت کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب کے مقابلے میں اخلاقی لحاظ

سے وہ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کے نظریہ انقلاب نبوی کو ہم قرآنی تعلیم سے متصادم سمجھتے ہیں۔ آیئے اب دیکھتے ہیں' موصوف نے جو قطع برید کی ہے وہ کس نوعیت کی ہے۔ مذکورہ دونوں اقتباسات کو غور سے پڑھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۹۹۳ء تک غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق جہاد پانچ صورتوں میں ہوسکتا تھا لیکن اب (برہان کی مذکورہ اشاعت کے وقت) جہاد صرف دو صورتوں میں ہوسکتا ہے۔ جہاد کی جن شکلوں پر غامدی صاحب نے صرف دس بارہ سالوں کے عرصہ میں خط تنسیخ پھیر دیا وہ یہ ہیں۔

۱۔ مملکت کے دفاع کی غرض سے۔
۲۔ مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لئے۔
۳۔ باغیوں کی سرکوبی کے لئے۔
۴۔ غلبہ دین کے لئے۔

اور جو نئی شق اس میں شامل کر دی گئی ہے وہ یہ ہے ''ظلم و عدوان کے خلاف''۔ موصوف کی پہلی تحقیق کے مطابق جو خیر سے قرآن و حدیث کی رو سے کی گئی تھی صرف مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لئے جہاد ہوسکتا تھا لیکن اب انہوں نے جو صرف ''قرآن مجید'' کی رو سے تحقیق کی ہے تو انہیں معلوم ہوا کہ ظلم و عدوان کے خلاف (خواہ مسلمانوں کے خلاف ہو یا غیر مسلموں کے خلاف) جہاد ہو سکتا ہے۔ موصوف نے ۱۹۹۳ء میں لکھا کہ جہاد اپنی حکومت (یعنی مسلمانوں کی حکومت) کے خلاف بھی ہوسکتا ہے اور دنیا کی دوسری حکومتوں کے خلاف بھی لیکن اب ۲۰۰۶ء میں وہ فرما رہے ہیں کہ جہاد صرف کافروں کے خلاف ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں کی کسی جماعت یا حکومت کے خلاف نہیں۔ پھر انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کافروں کے خلاف بھی جہاد کا حق مسلمانوں کو صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ خلافت علی منہاج النبوۃ کا نظام اس امت میں پوری امت کی سطح پر قائم کر دیں یعنی ایک ایسی اسلامی حکومت دنیا کے تمام اسلامی ممالک جس کے تابع ہوں۔ دوسرے لفظوں میں جب تک پوری دنیا میں مسلمانوں کی واحد حکومت نہ بن جائے یہ جہاد جائز نہیں ہے۔ چلیں بالفرض مان لیا کہ موصوف کا یہ حتمی موقف ہے۔ اب تو انہیں اس پر ڈٹ جانا چاہئے مگر افسوس انہوں نے یہ عبارت دے کر اس پر فٹ نوٹ میں یہ تحریر کیا ہے:

> ''اس مضمون کی تسوید کے وقت میرا نقطہ نظر یہی تھا۔ تاہم بعد کی تحقیق سے واضح ہوا کہ یہ منصب صحابہ کرامؓ ہی کے ساتھ خاص تھا۔ اس کا نہ بعد کے لوگوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ اس پر متفرع ہونے والے جہاد و قتال کے احکام کسی اور سے متعلق قرار دیے جا سکتے ہیں' لہٰذا ان کے بعد اب مسلمانوں کے لئے قیامت تک جہاد بالسیف کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے یعنی ظلم و عدوان کے خلاف

جہاد۔''

(برہان از غامدی' طبع چہارم' جون ۲۰۰۶ء' ص ۲۴۶ فٹ نوٹ)

ع جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

غامدی صاحب کے رشحاتِ قلم کے یہ نمونے دیکھ کر کوئی اپنا سر نہ پیٹ لے تو کیا کرے۔ اگر کوئی غیر مسلم اسلام کے ایک نظریہ جہاد ہی کی اتنی متنوع تعبیریں ایک ہی شخص کے منہ سے سن لے تو اسے خدا کی کتاب قرآن مجید کے متعلق جو گمان پیدا ہوگا۔ وہ ہمارے لئے کسی خوش فہمی کا باعث نہیں ہونا چاہئے۔ پھر موصوف نے جو علمی ''دیانت'' کا مظاہرہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موصوف کے متضاد دعوے دین اسلام کی تعبیریں نہیں بلکہ کسی دوشیزہ کی کہ مکرنیاں معلوم ہوتی ہیں۔ آپ مستشرقین میں سے گولڈزیہر سے لے کر سرولیم میور تک اور منٹگمری واٹ سے لے کر دورِ جدید کے ابن وراق تک کی کتابیں پڑھ جائیے ان کی نیت اور اسلوب نگارش سے قطع نظر' آپ کو کہیں بھی کوئی عبارت ایسی نہ ملے گی جس پر علمی خیانت کا لفظ صادق آ سکے۔ بدقسمتی سے یہ طرہ امتیاز صرف ہم مسلمانوں ہی کو حاصل ہو سکا ہے اور مسلمانوں میں سے بھی ان کو جنہیں ''حامیانِ دینِ متین'' اور ''مفتیانِ شرعِ مبین'' ہونے کا زعم ہے۔

موصوف کی تحریریں پڑھنے سے معلوم پڑتا ہے کہ وہ لکھتے وقت یا اس سے پہلے سوچنے سمجھنے کا تکلف بالکل نہیں فرماتے۔ جب کچھ لکھ چکتے ہیں اور اس کی تبلیغ و اشاعت کر چکتے ہیں تو پھر فارغ ہو کر اس پر سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ موصوف کا اپنا کہنا ہے کہ ایک اچھا لکھاری جب کوئی غلط بات لکھنے لگتا ہے تو اس کا قلم اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ موصوف نے ۱۳ جنوری ۱۹۹۵ء کو ''دین کا صحیح تصور'' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''آپ جب قلم اٹھائیں گے تو اگر قلم آدمی سوچ سمجھ کر اٹھانے کا عادی ہو تو پھر ہوتا یہ ہے کہ قلم خود رک جاتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں میں آگے نہیں چل سکتا...... ربط و نظام کے ساتھ اگر آپ کسی چیز کو ترتیب دے کر لکھنے کے عادی ہوں تو پھر آپ کا قلم روک کر آپ کو کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں یہ آگے بات نہیں بڑھ رہی ہے۔''

(آڈیو کیسٹ' تقریر بعنوان ''دین کا صحیح تصور''، ۱۳ جنوری ۱۹۹۵ء)

لیکن جب غامدی صاحب نبی و رسول اور جہاد کے متعلق یہ باہمد گر متضاد تحریریں لکھ رہے تھے جانے ان کا قلم خود کیوں نہ رک گیا اور یہ کیوں نہ کہا کہ نہیں میں آگے نہیں چل سکتا؟ نہ ہی ان کا قلم ان کو روک کر کھڑا ہوا اور نہ ہی یہ کہا کہ نہیں یہ بات آگے نہیں بڑھ رہی۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ موصوف اپنے ہی بیان کئے ہوئے اصول کے مطابق قلم سوچ سمجھ کر اٹھانے کے عادی نہیں ہیں۔

قرآن کریم نے جہاد (بمعنی جنگ) کے لئے

عام طور پر 'قتال' اور 'حرب' کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ قتال کے متعلق قرآن کریم کا نقطہ نظر کیا ہے' اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ (تفصیل کے خواہاں قارئین سرسید مرحوم کے فکری دست راست جناب چراغ علی مرحوم کی انگریزی کتاب "Critical Exposition of the Popular Jihad" کا مطالعہ کریں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ خواجہ غلام الحسنین نے کوئی سو سال ادھر کیا تھا۔ اب اصل کتاب اور اس کا ترجمہ دوست ایسوسی ایٹس لاہور نے شائع کیا ہے)۔ مختصراً یہ ہے کہ قرآن کی رو سے قتال صرف دفاع کے لئے ہے کسی ملک یا قوم پر حملہ کرنے (Offence) یا جارحیت (Agression) کے لئے نہیں ہے۔ جس قوم پر بھی ظلم ہو' انہیں قتل کیا جا رہا ہو' گھروں سے بے دخل کیا جا رہا ہو' عزتوں کو پامال کیا جا رہا ہو' اس قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دفاع میں بہترین دستیاب حربی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے تحفظ خویش (Self Preservation) کا حق استعمال کرے۔ اس سلسلے میں چونکہ ظالم قوم اور مظلوم قوم کے حالات کا حتمی تعین نہیں کیا جا سکتا اس لئے یہ فیصلہ بھی مظلوم قوم کے حالات پر منحصر ہے کہ اسے کب اور کیسے اٹھنا چاہئے۔ اس کے لئے غامدی صاحب کی پیش کی گئی شرط کہ بغاوت کرنے والے پہلے کسی آزاد علاقے میں جا کر اپنی حکومت قائم کریں (برہان' ص ۲۷۹' طبع ۲۰۰۶ء) محض استنباطی موشگافیوں اور قلت فہم کا اظہار ہے۔ قرآن کریم نے ایسی کوئی شرط لازم قرار نہیں دی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں موصوف ایک تازہ شریعت ایجاد کر رہے ہیں۔ ؎

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

موصوف کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آج دنیا کے معروضی حالات چودہ سو سال پیشتر سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ پوری دنیا میں آزاد علاقہ تو ایک طرف رہا' آج ایک ملک سے دوسرے ملک میں انسان اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک دونوں ممالک اس کی اجازت نہ دے دیں۔ ایسے میں یہ شرط عائد کرنا کہ پہلے آزاد علاقہ میں اپنی حکومت قائم کی جائے' دراصل قرآنی تعلیم کے ساتھ اپنی اجنبیت کا بالواسطہ اعلان اور جہاد کی بالفعل نفی کے مترادف ہے۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں خلافت عثمانیہ جس میں ترکی' عرب' حجاز' شام' مصر اور فلسطین کی ریاستیں شامل تھیں' اپنے زوال کی طرف گامزن تھی۔ اس کے دشمن ممالک روس' اٹلی' برطانیہ اور یونان اس پر دندان آز گاڑے ہوئے تھے۔ یورپ کے اس ''مرد بیمار'' کے عیش پسند اور نااہل حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے پوری خلافت اسلامیہ میں حالات دگرگوں تھے۔ کہیں عرب قومیت پروان چڑھ رہی تھی تو کہیں علیحدگی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ مسلمانوں کی یہ ریاستیں تو

علیحدہ ہوتی نظر آ ہی رہی تھیں ۔ یہ خدشہ پیدا ہو چلا تھا کہ خود ترکی اغیار کے قبضے میں نہ چلا جائے ۔ ایسے میں چند دردمند اور محبّ وطن ترک آگے بڑھتے ہیں اور کسی آزاد علاقے میں جا کر نہیں بلکہ ترکی کے اندر رہ کر ہی ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کرتے ہیں ۔ بہت جلد اسے انور پاشا اور مصطفیٰ کمال پاشا جیسے باصلاحیت رہنما مل جاتے ہیں ۔ اپنے ہی نااہل اور ناکارہ حکمرانوں کے خلاف خروج کرتے ہوئے ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے رہنما' خلیفہ کو معزول کر دیتے ہیں ۔ پہلی جنگ عظیم میں عبرت ناک شکست کے باوجود مصطفیٰ کمال ترکی کو سنبھالا دینے میں بالآخر کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس جدوجہد کے دوران مصطفیٰ کمال پاشا نے انگورہ (انقرہ) میں آزاد حکومت قائم کی ۔ یہ انقرہ خلافت عثمانیہ سے باہر کوئی ''آزاد علاقہ'' نہیں تھا بلکہ خلافت عثمانیہ جس کی حدود نہایت وسیع تھیں ایک طرف رہی' یہ تو ترکی کا ہی شہر تھا ۔ ترک قوم کے اس عظیم مجاہد نے بروقت اقدامات کرتے ہوئے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیئے اور ترک قوم کو غلامی میں جانے سے صاف بچا لیا ۔ اگر وہ یہ اقدام نہ کرتے تو آج ترکی کے حصے بخرے اتحادی افواج کے قبضے میں ہوتے ۔ بہت ممکن تھا کہ آج سمرنا یونان کے پاس' استنبول برطانیہ و فرانس کے پاس اور انقرہ اٹلی کے پاس ہوتا ۔ اسی ایک مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ ''آزاد علاقے میں جا کر حکومت قائم کرنے'' کی شرط کس قدر بچگانہ اور حقائق سے کس قدر بعید ہے ۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کے بعد مغربی دنیا میں اسلام اور جہاد کے خلاف ایک خاص قسم کی فضا پیدا ہو گئی تھی ۔ ایسے میں غامدی صاحب سے بھی ایک انٹرویو میں ان کا موقف معلوم کیا گیا ۔ یہاں صرف دو سوالات اور ان کے جوابات نذر قارئین کئے جاتے ہیں ۔

''سوال: غلامی کے خلاف آزادی کی جنگوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: آزادی اور غلامی کے الفاظ جو آج کل استعمال ہو رہے ہیں ۔ یہ جمہوریت کے بعد بالکل بے معنی ہو چکے ہیں ۔ جو لوگ یہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں وہ اصل میں پچھلی صدی میں رہ رہے ہیں ۔ دنیا میں آزادی اور غلامی کے تصورات ہی بالکلیہ بدل گئے ہیں ۔ اب حکومت اکثریت کی ہوتی ہے ۔ ہندوستان میں اگر ہندوؤں کی اکثریت ہے تو ان کی حکومت ہو گی اور اگر ہم اپنی اکثریت قائم کر لیتے ہیں ۔ تو ہماری حکومت ہو گی ۔ تاہم کسی جگہ پر اگر اکثریت پر کوئی اقلیت اپنا تسلط قائم کئے ہوئے ہے تو اس کے خلاف سیاسی جدوجہد کرنی چاہئے ۔ جنگ و جدال جیسے اقدامات کبھی پابند حدود نہیں رہتے ..... ۔

سوال: لیکن کشمیر میں تو مسلمانوں کی اکثریت ہے؟

جواب: کشمیر کی صورتِ حال مختلف ہے۔ کشمیر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین تنازع یہ ہے کہ یہ خطہ ہندوستان کا حصہ ہے یا پاکستان کا۔ وہاں جھگڑا اکثریت اور اقلیت کا نہیں ہے۔ وہاں ایک سیاسی مسئلہ ہے کہ ہندوستان یہ کہتا ہے کہ کشمیر کا الحاق ہمارے ساتھ ہو چکا ہے اور ہم یہ کہتے ہیں کہ کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ نہیں ہوا۔ یہ اصل میں ۱۹۴۷ء کا ایجنڈا ہے۔ جس پر دو ملکوں کے مابین سیاسی اختلاف ہے۔ اسے سیاسی طریقے ہی سے طے ہونا چاہئے۔''

(ماہنامہ اشراق' نومبر ۲۰۰۱ء' ص ۶۲۔۶۱)

قارئین محترم اگر تھوڑی دیر کے لئے اس بات سے صرف نظر کر لیا جائے کہ دراندازوں کو کشمیر میں جا کر عسکری کارروائیاں کرنے کا حق ہے یا نہیں' سوال یہ ہے کہ جن مظلوم و مقہور کشمیری مسلمانوں پر پچھلے ۵۹ سال سے بالعموم اور پچھلے ۱۶ سال سے بالخصوص عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے' جن کی عصمتیں تار تار کر دی گئی ہیں' گھر جلا دیئے گئے ہیں' بچے یتیم کر دیئے گئے ہیں اور ایک لاکھ سے زائد افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے' کیا انہیں اپنے دفاع میں طاقت کے استعمال کا کوئی حق حاصل نہیں ہے؟ کیا وہ کسی مہدی و مسیح کے انتظار میں بیٹھے رہیں جو آ کر پہلے کسی آزاد خطہ میں ان کی حکومت قائم کرے اور پھر یہ اپنے دفاع میں حربی وسائل بروئے کار لائیں۔

جہاد کشمیر کے متعلق جو کچھ موصوف نے فرمایا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان کے ممدوح جناب مودودی صاحب ۱۹۴۸ء میں جہاد کشمیر کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ غامدی صاحب کے نظریہ جہاد کی رو سے مسلمان ممالک میں سے پاکستان سمیت کوئی بھی مظلوم کشمیریوں کی مدد اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک 'خلافت علی منہاج النبوۃ' کا نظام اس امت میں پوری امت کی سطح پر قائم نہ کر دیا جائے۔ دوسری صورت جو غامدی صاحب نے بیان فرمائی ہے وہ خود مظلوموں کی بغاوت (یعنی خروج) ہے۔ لیکن اس کے لئے انہیں پہلے کسی آزاد خطے میں جا کر اپنی حکومت قائم کرنا ہوگی۔ اب مظلوم کشمیریوں کے لئے ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' والا معاملہ ہے کیونکہ نہ کبھی آزاد خطے میں ان کی حکومت قائم ہوگی نہ ہی عالمی سطح پر مسلمانوں کی 'خلافت علی منہاج نبوۃ' قائم ہوگی اور نہ ہی ان بیچاروں کو کبھی آزادی نصیب ہوگی۔ گویا ؎

نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی

نتائج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کا نظریۂ تنسیخ جہاد اور علامہ جاوید غامدی صاحب کا نظریہ جہاد بالکل متماثل ہیں۔ ادھر جہاد اعلانیہ موقوف کر دیا گیا اور ادھر اتنی کڑی شرائط عائد کر دی گئیں کہ انہیں پورا کرنے کے لئے عمر خضر بھی کم پڑ جائے۔ مرزا صاحب اور غامدی صاحب کے الفاظ مختلف مگر نتائج فکر ایک

جیسے ہیں۔ اس کے باوجود اگر غامدی صاحب منکرین ختم نبوت کے نظریہ تنسیخ جہاد پر معترض ہوں تو مرزا صاحب یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں گے کہ ؎

میری نگاہ شوق پر اس درجہ سختیاں
اپنی نگاہ ناز کی کچھ بھی خبر نہیں

پچھلے دنوں پاپائے اعظم بینڈکٹ ششدہم نے بھی اسلام کے نظریہ جہاد کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ریجنز برگ یونیورسٹی جرمنی میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اسلام میں جہاد بلا جواز اور خدائی فطرت کے خلاف ہے''۔ پوپ کے اس بیان پر اسلامی ملکوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی حتیٰ کہ ہمارے ملک کی اسمبلیوں میں پاپائے اعظم کے اس بیان کی مذمت میں قراردادیں پیش کی گئیں مگر ہماری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب اس احتجاج میں غامدی صاحب نے بھی اپنی آواز ملا دی۔ روزنامہ جنگ مورخہ ۱۵ستمبر ۲۰۰۶ء کے مطابق:

''پاکستان کے عالم دین جاوید احمد غامدی نے پوپ کے بیان کو غیر ذمہ دارانہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ نظریہ جہاد کا مقصد تلوار کے ذریعے اسلام پھیلانا نہیں تھا۔''

حالانکہ نتائج کے لحاظ سے پاپائے اعظم نے وہی بات کی تھی جس کی موصوف گذشتہ چند سالوں سے پاکستان میں تحریر و تقریر اور ٹیلی ویژن کے ذریعے تبلیغ و اشاعت کر رہے ہیں۔ فرق صرف الفاظ کے انتخاب کا ہے۔ موصوف کا بیان پڑھ کر پاپائے اعظم نے دل میں ضرور کہا ہوگا۔ ؎

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس برابر است
باما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

قتال یعنی جہاد بالسیف کے متعلق ان 'شیخِ کلیسا نواز' [1] نے ایک عجیب وغریب دعویٰ بھی فرمایا ہے' لکھتے ہیں:

''مسیح علیہ السلام کی دعوت میں یہ مرحلہ (یعنی حکومت و اقتدار۔م۔س) نہیں آیا تو انہوں نے جہاد و قتال کا نام بھی نہیں لیا۔۔۔۔ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ میں اقتدار حاصل نہ ہوتا تو انجیل کی طرح قرآن میں بھی قتال کی کوئی آیت نہ ہوتی۔''

(میزان' طبع دوم ۲۰۰۲ء ص ۲۴۴)

ایک جگہ پر موصوف حضرت عیسیٰؑ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''ان کی دعوت جہاد کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔''

(اشراق' دسمبر ۱۹۹۳ء' ص ۲۸)

مذکورہ عبارتوں کا لُبِ لباب یہ ہے کہ موصوف کے دعوے کی رُو سے:

۱۔ انجیل میں قتال کی کوئی آیت نہیں ہے۔

۲۔ جناب عیسیٰؑ نے جہاد و قتال کا کبھی نام نہیں لیا اور ان کی دعوت جہاد کے ذکر سے خالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موصوف کا یہ اعتراض اپنی حدود علم کا اندازہ کئے بغیر قلم اٹھا لینے کی بڑی افسوس ناک مثال ہے۔ مذہبی دنیا میں سب سے دلچسپ صورت حال تب پیدا ہوتی ہے' جب ملا کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے جس کا تعلق کتاب اللہ سے ہو کیونکہ کلام اللہ سے ملا کی واقفیت بس اتنی ہی ہوتی ہے جو ثواب کی خاطر تلاوت قرآن کے لئے ضروری ہو۔ اب تک ہمارا خیال تھا کہ موصوف صرف تلون ہی میں مبتلا ہیں' مگر ان کے اس دعوے سے یہ حقیقت بھی کھلی کہ ان کی قرآن فہمی کا معاملہ بھی بس اسی طرح ہے۔ انجیل میں قتال کی کسی آیت کو نہ پا سکنے کی موصوف کی محرومی کا علاج تو ہمارے پاس نہیں ہے مگر غیر جانبدار قارئین سے اتنی گذارش ہے کہ وہ ذرا سورہ توبہ کی اس آیت پر ایک نظر ڈال لیں:

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون وعدا علیہ حقا فی التوراۃ ولا نجیل والقران۔ (۱۱۱/۹)۔

ترجمہ: بے شک اللہ نے مومنین سے ان کے جان و مال خرید لئے ہیں اور بدلے میں ان کو جنت دے دی ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں۔ وہ مرتے بھی ہیں اور مارتے بھی ہیں یہ اللہ کے ذمہ ایک سچا پکا وعدہ ہے تورات میں' انجیل میں اور قرآن میں۔ (۱۱۱/۹)۔

قرآن کی یہ آیت غیر مبہم الفاظ میں بتا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والے مومنین کے جان و مال کے بدلے جنت کا پکا سچا وعدہ صرف قرآن میں ہی نہیں بلکہ تورات و انجیل میں بھی کیا گیا ہے۔ موصوف نے یہ دعویٰ غالباً اس امید پر کر لیا ہے کہ آج کے اس گئے گذرے دور میں وہ لوگ ہی کتنے ہیں جو قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھ سکتے ہیں اور اس طرح اس دعوے کی حقیقت سے آگاہ ہو جانے کے بعد ان کی مشائخیت کو چیلنج کر سکتے ہیں۔ وہ یہ جملہ لکھنے سے پہلے اگر قرآن نہیں تو عہد نامہ جدید کی کم سے کم پہلی کتاب ہی کی طرف مراجعت کر لیتے تو وہاں جناب عیسیٰؑ کی یہ دعوت ملاحظہ کی جا سکتی تھی:

''یہ نہ سمجھو میں زمیں پر صلح کرانے آیا ہوں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔''

(متی' باب ۱۰' آیات ۳۵۔۳۴)

موصوف کے مذکورہ دعوے پر ان کی خدمت میں اب اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ:

نگاہ تیری فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ

ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ؟

مضمون کے اختتام پر اس مرد قلندر کی جرأت رندانہ کا ایک واقعہ نذر قارئین ہے جس کی شب زندہ داریوں اور خلوص نیت کے صدقے میں ہمیں پاکستان جیسی نعمت حاصل ہوئی تھی۔ ہماری مراد سرسید احمد خاں مرحوم سے ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ ہے۔ مسلمانوں کی جنگ آزادی ناکامی سے دوچار ہو چکی ہے۔ حاکم قوم ہر مسلمان کو مشکوک اور بدگماں نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ ابھی تازہ تازہ بنگال کے چیف جسٹس مسٹر نارمن ایک سرپھرے مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔ حکمرانوں کی تشویش ناک بدگمانیاں اور غیض وغضب اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہا ہے'۔۔۔۔ ایسے میں ایک انگریز ڈاکٹر ہنٹر (Dr. Hunter) انتہائی اشتعال انگیز کتاب تحریر کرتا ہے۔ جس کا نام ہے (Our Indian Muslmans)۔ کتاب کے سرورق پر یہ خطرناک جملہ درج ہے۔

''کیا ہمارے ہندوستانی مسلمانوں پر ازروئے ایمان ملکہ معظّمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے؟''

(پاکستان کا معمار اول۔ از صفدر سلیمی۔ ص ۳۵)

اس کتاب میں مصنف نے اپنا سارا زور قلم اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کر دیا کہ:

''مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتی ہے اور کسی طرح بھی گورنمنٹ کی خیرخواہ نہیں ہے۔''

(ایضاً' ص ۳۵)

آپ ذرا سوال کی اٹھان اور حالات کی نزاکت کو دیکھئے۔ سرسید احمد خان اس وقت خود سرکار کے ملازم ہیں۔ مگر انہوں نے سرکاری ملازمت کی تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ڈاکٹر ہنٹر کی مذکورہ کتاب کے ابواب کا مدلل رد' اخبار ''پائینئر'' کے کالموں میں شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حکمران طبقے کو جب سرسید کے ذریعے مسلمانوں کا صحیح موقف معلوم ہوا تو انہوں نے ڈاکٹر ہنٹر کی لگائی ہوئی آگ کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ہنٹر نے انتہائی چبھتا ہوا ایک سوال مسلمانوں کے ''علماء'' سے کیا' سوال یہ ہے۔

''اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو کیا اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی امان ترک کرنا اور غنیم کی مدد کرنا جائز ہوگی؟''

(ایضاً' ص ۳۸)

احبار و رہبان کی طرف سے مکمل سکوت کے بعد سرسید نے ڈنکے کی چوٹ پر اس سوال کا جواب ''پائینئر'' کے کالموں میں یوں دیا:

''کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل کسی بڑے ہنگامے میں قوم کا کیا حال ہوگا لیکن میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو

ان کی پولیٹیکل حالت ان سے کرائے گی۔''

(ایضاً، ص ۳۸)

دیکھ لیجئے، سرسید نے یہ نہیں کہا کہ 'حضور کہاں کا جہاد؟ وہ تو رسولوں کے قانون اتمام حجت اور صحابہ کے قانون شہادت کے ساتھ مخصوص تھا۔ رسالت رسولوں کے ساتھ اور صحابیت صحابہ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اب عام مسلمانوں پر قیامت تک کے لئے کوئی جہاد فرض نہیں ہے'۔ ایک محکوم و غلام، ان پڑھ اور پسماندہ قوم کے دور اندیش اور جرأت مند نمائندہ کا جواب یہ تھا کہ مسلمان وہی کریں گے جیسا کہ سیاسی حالات کا تقاضا ہو گا اور ایک ہمارے یہ موصوف ہیں جو ایک آزاد، نسبتاً پڑھی لکھی اور کم پسماندہ قوم کی راہنمائی کا دم بھر رہے ہیں اور جہاد سے متعلق کچھ اس طرح سے پینترے بدل رہے ہیں جسے دیکھ کر ؎

دیدہ ام جبریل امیں را در خروش

(جاری ہے)